نہرو بال پستکالیہ
دس کہانیاں

نہرو بال پستکالیہ —— 52
NEHRU BAL PUSTAKALAYA
دس کہانیاں
مرتب
سراج انور
مصور
اعجاز نقوی
نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا
نئی دہلی

سزا

عصمت چغتائی

چچا ابا ویسے تو صبح شام مگدر ہلاتے، ٹینس کھیلتے اور گھوڑے کی سواری کرتے مگر انہیں ایک کام کرتے بڑی الکس آتی تھی اور وہ تھا چھٹو میاں کی پٹائی کرنا۔ جب کبھی چھٹو میاں کوئی بڑی بھیانک شرارت کر بیٹھتے تو چچی اماں انہیں لے کر چچا ابا کے پاس جاتیں۔

"خدا کے لیے اسے ماریئے۔"

1979 ساکا 1901

DUS KAHANIYAN (URDU)

قیمت : Rs. 4.00

ڈائریکٹر نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا A-5 گرین پارک نئی دہلی 110016 نے
جے کے آفسیٹ پرنٹرز مٹیا محل دہلی 6 میں چھپوا کر شائع کیا
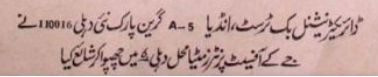
"بھئی واہ۔ خواہ مخواہ ماروں۔" وہ چونک کر جواب دیتے۔

"اس نے میری نئی چائے دانی توڑ ڈالی۔"

"تو بھئی تم خود مار لو۔ میں اخبار پڑھ رہا ہوں۔ سوئیز کنال پر انگریزی اور فرانسیسی فوجوں نے قبضہ کر لیا ہے۔"

"اے ہے کیوں؟"

"سوئیز کنال کی حفاظت کے لیے۔"

"اوئی یہ اچھی حفاظت ہوئی کہ خود چڑھ بیٹھے۔"

"ہاں، اگر چنو کے چائے دانی توڑنے سے پہلے تم خود توڑ دیتیں تو آج مجھے اس کو مارنے کی زحمت کیوں اٹھانا پڑتی۔"

"اے واہ یہ اچھی رہی" چچی اماں چڑھ گئیں۔

"چولھے میں جائیں یہ اللہ ماری فوجیں۔ میں آپ سے کہہ رہی ہوں بچہ خراب ہوا جاتا ہے۔ آپ کو پرواہ ہی نہیں۔ اتنا نہیں ہوتا کہ ذرا تنبیہہ کر دیں۔" چچی بی رہانسی ہو گئیں۔

"اچھا بھئی اخبار تو ختم کر لوں۔" اور وہ اخبار میں ڈوب گئے۔ مگر چچی اماں کو بھی ضد ہو گئی تھی کہ
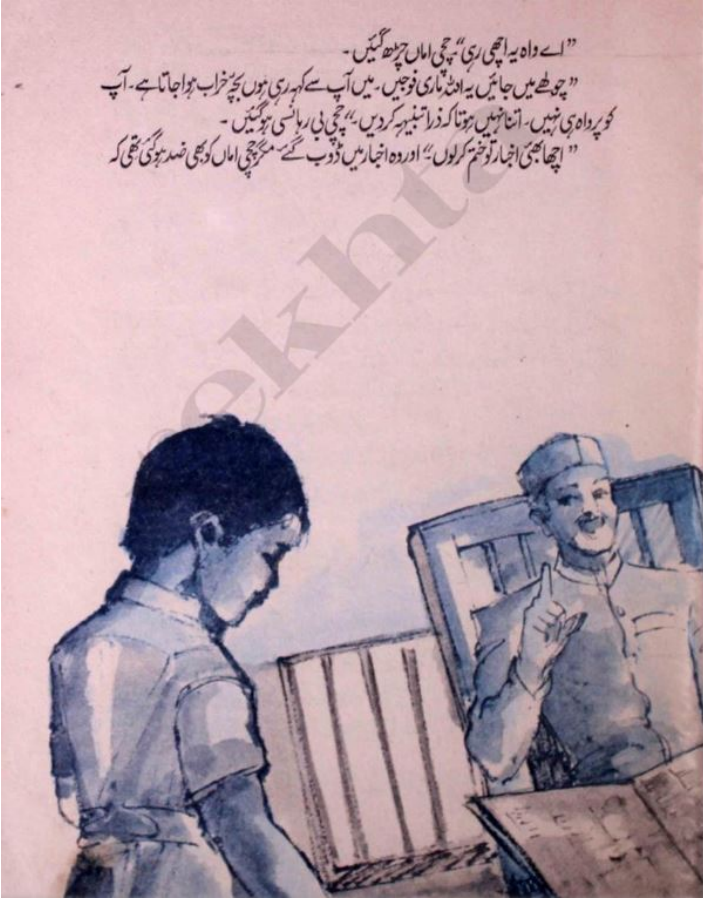
آج تو پٹوا کے چھوڑیں گی۔ غصہ ضبط کیے بیٹھی رہیں۔ ادھر چنو کا برا حال، ابا نے آج تک نہ مارا تھا۔ بڑے بگڑے ہیں۔ مگر ایسے ہلاتے ہیں جیسے وہ پھول ہوں۔ آج ہڈی پسلی کی خیر نہیں۔ اشتہار تک پڑھ ڈالے۔ کارٹون پر قہقہہ لگایا۔ پھر جب دوبارہ ایڈیٹوریل دیکھنے چلے تو چچی جان نے اخبار چھین لیا۔

"آپ کو قسم ہے میری جان کی۔ آج اس نالائق کو سزا دینی ہی پڑے گی۔"

"بیگم ہمیں غصہ بھی تو نہیں آرہا ہے۔ اس وقت تو تم ہی مار لو۔ ہم پھر کسی دن اور مار دیں گے۔" چچا ابا نے لجاجت سے کہا۔ چچی امی رو پڑیں۔

"آپ اس کا ناس مار کر رہیں گے۔" وہ اپنے کمرے میں روٹھ کر جا بیٹھیں۔

"اچھا بھئی۔ چلو میاں چنو۔ تم بھی کیا بے وقت شرارتیں کرتے ہو۔ اماں وقت دیکھو نہ گھڑی، اب بھری دوپہر میں پٹائی کرنا کوئی دلچسپ کام ہے؟" چچا ابا نے عاجزی سے کہا۔ چنو کو ان پر ترس آگیا۔ "اماں کوئی چھڑی وڑی بھی تو نہیں۔ چلو پہلے ایک اچھی سی قمچی توڑ لائیں۔ کیوں؟ کیا رائے ہے تمہاری؟" چچا ابا نے چنو کو انگلی پکڑا دی جیسے وہ اسے میلہ دکھانے لے جا رہے ہوں۔

"جی ہاں۔" چنو نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

پیڑوں میں سے دونوں نے چھانٹ چھانٹ کر پانچ چھ عمدہ عمدہ قمچیاں توڑیں۔ چنو بھی دوڑ کر اپنا چاقو لے آیا اور چچا ابا کی مدد کرنے لگا۔ جب قمچیاں تیار ہو گئیں تو انہیں جمع کر کے دونوں چچا ابا کے کمرے میں پہنچے۔

"دیکھیں یہ قمچیاں کچھ کام کی بھی ہیں یا نہیں۔" چچا ابا نے ایک قمچی زور سے تکیے پر ماری۔ پتلی سی قمچی ٹوٹ گئی۔

"دیکھا کم بخت کتنی بودی نکلی۔ اب ہم بھلا تمہیں کیسے پیٹتے۔ فوراً تو ٹوٹ جاتی۔"

"اس سے تو چوٹ بھی نہیں لگتی۔ یہ دیکھیے۔" چنو نے قمچی کو اپنی ران پر مارا۔ جو اور بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ چچا ابا نے دوسری قمچی اٹھائی اور تکیے پر ماری۔ آواز آئی "بھم"۔

"اف...... یہ تو بڑی خوفناک ہے۔" چچا ابا نے کانپ کر کہا۔ "اگر اس سے تمہاری مرمت کی گئی تو ہڈی پسلی ٹوٹ جائے گی۔ تمہاری امی روئیں گی وہ تو تمہیں سزا دلوانا چاہتی ہیں، ہڈی پسلی تھوڑی تڑوانا چاہتی ہیں کیوں بھئی؟"

"جی ابا جان۔" ساری قمچیاں آزمائی گئیں مگر کوئی بھی اطمینان بخش نہ ثابت ہوئی۔

"اب بتاؤ کیسے پیٹا جائے تمہیں؟" چچا ابا سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ ابا کو یوں پریشان دیکھ کر چنو کے آنسو آ گئے۔

"اماں کوئی ترکیب بتاؤ نا کیا لگاؤ دی تم ایک اچھی قمچی نہیں ملتی تمہیں۔" دونوں سوچ میں ڈوب گئے۔

"ابا جان!" چنو نے کچھ سوچ کر کہا۔

"کیا بیٹے۔"

"وہ جو آپ کی سواری کرنے کا بینت ہے؟"

"ہا ہاں۔"

"وہ بہت اچھا رہے گا۔ بہت موٹا بھی نہیں کہ میری ہڈی ٹوٹ جائے اور مضبوط بھی ہے۔"

"ارے ہاں وہ ٹھیک رہے گا۔ بھئی واہ تم تو بڑے ہوشیار ہو۔ ذرا لے آؤ تو لپک کے۔" اور چنو میاں مارے خوشی کے دیوانے ہو کر بھاگے بینت لینے۔

چچی امی بے چاری تکیے پر مار پڑنے سے بیٹھی لرز رہی تھیں۔ وہ سمجھ رہی تھیں چنو پٹ رہا ہے۔ کانوں میں انگلیاں دیے بیٹھی تھیں۔ چنو کو جو یوں سرپٹ آتے دیکھا تو گھبرا گئیں۔ "بینت لینے جا رہا ہوں۔ قمچیاں سب ردی نکل گئیں۔" بھاگتے بھاگتے چنو نے کہا۔

اماں چڑ گئیں کہ ماری نہیں چکتے اتنی دیر سے یہ انتظار میں یونہی کانوں میں انگلیاں ڈالے رہیں۔ تیر کی طرح بینت لے کر چنو پہنچے تو چچا ابا ایک کتاب میں غرق تھے۔

"یہ لیجیے بینت۔" چنو نے فخریہ بینت دیا۔

"یہ ٹھیک رہے گا؟" چچا میاں نے شک بھرے لہجے سے کہا۔

"جی ہاں اس سے ہڈی نہیں ٹوٹے گی۔"

"ذرا آزما کر دیکھو تکیے پر کیسی آواز دیتا ہے۔"

چنو نے سڑ سڑ تکیے پر بینت مارنے شروع کر دیے جیسے سچ مچ خود کو پیٹ رہا ہو۔ مارتے مارتے وہ تھک گیا اور چچا ابا کتاب میں غرق رہے۔

"بینت ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔ مگر یار بڑی سستی آ رہی ہے۔" چچا ابا نے جماہی لی۔ "دیکھو نا مارنا کوئی آسان کام تو نہیں۔ ذرا دو چار ہاتھ لگائے ہوں گے اور آپ تھک گئے۔ کیوں؟"

"جی ہاں ابا جان"، چنو نے نادم ہو کر کہا۔
"ایک کام کرو گے دوست"
"جی ہاں"
"ایسے بے وقت شرارت نہ کیا کرو تو تمہاری مہربانی ہوگی۔ تمہاری امی کو بھی بڑا دکھ ہوتا ہے۔
اور دیکھو جس دن شرارت کرنا ہو ہم سے پہلے کہہ دیا کرو تاکہ ہم ورزش نہ کریں پھر ہم تمہاری پٹائی ضرور
کریں گے۔ سمجھے"
اِدھر ابا جان اُداس اُدھر نیچے امی رو رہی تھیں۔ چنو کا سر شرم سے جھک گیا۔ جسم پر کسی قمچی کے
نشان نہ تھے مگر چنو کے دل پر نشان پڑ گئے۔ اس نے جا کر امی سے معافی مانگ لی۔

آئس کریم

جیلانی بانو

مجو تو پیدا ہوتے ہی نظر انداز کر دیا گیا تھا۔
گھر میں دنیا کی چیزیں آتیں۔ چنو اور منے خوب سنگترے کھاتے، مٹھائیاں اڑاتے، مگر جہاں وہ
اپنا مٹکا سا پیٹ سنبھالتا ہوا ان کے قریب جاتا، آپا گھسیٹ کر دوسری طرف پھینک دیتیں۔
"اونہہ دوائیں پلاتے پلاتے ناک میں دم آگیا ہے اور ندیدہ کھانے کو دوڑ رہا ہے۔" وہ گھنٹوں
ایڑیاں رگڑ رگڑ کے زمین پر مچلتا۔ ہر ایک کو فریادی نظروں سے دیکھتا مگر جو نظر بھی اس پر اٹھتی "اے ہے
ناک صاف کرو اس کی کتنی رال بہہ رہی ہے توبہ" پھر وہ انتقاماً اپنی ناک کی غلاظت ہونٹوں سے مونہہ
میں گھسیٹ لیتا یا مونہہ پر بھنکنے والی مکھیوں سے آنکھ مچولی کھیلنے میں رونا بھول جاتا تھا۔
یہ محرومی کی بڑی لمبی داستان تھی۔

مگر آج مجوّ اتنا بے وقوف نہ تھا جیسا لوگ اُسے سمجھتے تھے۔ بس ذرا ہاتھ پاؤں میں اتنی سکت نہ تھی کہ چنو کی طرح مار دھاڑ سے میدان جیت لے۔ ابا کی طرح ہر بیماری کو بھی مجو پر بڑا پیار آتا تھا۔ اگر دو تین مہینے سے وہ بیک وقت کئی بیماریوں میں مبتلا نہ ہوتا، تو اس وقت بڑی آسانی کے ساتھ آئس کریم کی ایک پلیٹ جھپٹ کر پلنگ کے نیچے گھس سکتا تھا۔ تین دن سے اُسے بہت تیز بخار آ رہا تھا۔ ڈاکٹر نے معمولی غذا اور ٹھنڈے پانی تک کو منع کر دیا تھا۔ مگر سارا گھر اس کے سینے پر مونگ دلنے کے لیے اس کے کمرے میں بیٹھا آئس کریم کھا رہا تھا۔

اس گھر میں اللہ میاں جتنی بیماریاں بھیجتے تھے، ان کی دوستی مجوّ کے علاوہ کسی سے نہ ہوتی۔ وہ ایک بچھڑے ہوئے دوست کی طرح اس کے گلے سے لپٹتیں تو پھر چھوڑنے کا نام ہی نہ لیتیں۔ ہائے خدا کی اس خدائی میں کیسا ناانصافی کا راج تھا۔ سب اس کے سامنے بیٹھے ٹھنڈی ٹھنڈی، میٹھی میٹھی، خوشبودار آئس کریم کھا رہے تھے۔ مگر اسے جب بھی بھوک لگتی اماں لجلجا سا گودا نہ لے آتیں اور ابا پیار جتانے پر آتے تو ــــ "دوا پیے گا ہمارا اچھا بیٹا۔ شاباش بیٹے، ذرا یہ کونین کی گولی تو کھا لینا۔" لوگ اُسے ڈانٹتے تھے تو دوا پلانے کے لیے، پیار کرتے تھے تو دوا پلانے کے لیے۔ پلنگ پر لیٹے لیٹے بند آنکھوں کی جھری سے جھانک کر وہ سب کو آئس کریم کھاتے دیکھ رہا تھا اور اس کا مونہہ پھیکے پھیکے پانی سے بار بار بھر رہا تھا۔

اچانک اس کے کمزور جسم میں خوب طاقت آ گئی۔ وہ لپک کر پلنگ سے اٹھا اور سب کے ہاتھوں میں سے پلیٹیں چھین کر ادھر اُدھر بھگا دیا۔ چنو جیسے پہلوان کو تھپڑ مار کر نیچے گرایا۔ آپا اس کے ڈر سے اٹھ کر باورچی خانے میں بھاگیں اور خود سر مغرور منا، سعادت مندی کے ساتھ اپنی پلیٹ مجو کے سامنے کر کے ہٹ گیا۔ اندر سے کمرہ بند کر کے، بڑے اطمینان کے ساتھ، کرسی کے بجائے میز پر چڑھ کر وہ بیٹھ گیا اور دونوں ہاتھوں میں ایک ایک چمچہ پکڑ کے دونوں آئس کریم کھانے لگا خوب پیٹ بھر کے کھائی ــــ مگر جانے کیا بات تھی کہ وہ مجوّ کو زیادہ میٹھی نہ لگی۔ کچھ سخت بھی تھی۔ شاید برف زیادہ ڈالا تھا جو بڑی محنت سے چبانا پڑی۔ مجوّ کے کمزور دانتوں میں درد ہونے لگا۔

خیر اس وقت تو انتقام کی آگ میں جھلس کر اس نے خوشبو اور ذائقے پر دھیان ہی نہ دیا ــــ مگر جب وہ پھر بستر پر جا کے لیٹا تو منے نے اتنی زور سے پلیٹ توڑی کہ وہ اُچھل پڑا ــــ آنکھیں کھول کر اس نے دیکھا۔ سب پھر کمرے میں موجود تھے۔

وہ پھر سونا چاہتا تھا مگر پیٹ میں بڑے زور کا درد ہو رہا تھا۔ اتنا ناقابل برداشت کہ اس کی چیخیں سُن کر امی دوڑی آئیں۔ انہوں نے اپنے آزمودہ نسخوں کو آزمانے کے بعد ابا کو بلوایا اور ابا نے گھبرا کے ڈاکٹر کو فون کیا۔

'ہائے بدبختی میں ذرا سی آئس کریم کھا کر کتنی بڑی غلطی کی اُس نے۔ کاش وہ امی کا کہا مانتا!'

ڈاکٹر نے تو مجوّ کو قتل کا مجرم سمجھا اور باقاعدہ سراغ رسانی شروع کر دی۔ آج سے ایک مہینے پہلے تک کھائی گئی چیزوں کے نام پوچھنا شروع کر دیے۔

ڈرتے ڈرتے مجوّ کو اعتراف کرنا پڑا کہ اس نے ابھی ذرا سی، سفید سفید، ملائم ملائم، میٹھی میٹھی،

آئس کریم چکھی تھی۔ مگر ڈاکٹر بدستور پریشان تھا۔ ڈاکٹر کا خیال تھا کہ درد آئس کریم کھانے سے نہیں ہو سکتا اس نے تو کوئی ایسی چیز کھائی تھی جو ہضم ہی نہیں ہو سکتی۔

چلو اچھا ہوا اس پر سے الزام تو گیا۔

ارے یہ کیا ——

مجّو نے دیکھا آپا اس کا تکیہ ہاتھوں میں تھامے حیران کھڑی تھیں۔ تکیہ کے آدھے حصے کی روئی غائب تھی اور کسی نے اس کی دھجیاں بکھیر دی تھیں

"یہ تکیہ کس نے چباڈالا۔؟" امّی نے گھبرا کے پوچھا۔

"میں نے تو —— میں نے تو آئس کریم کھائی تھی" —— مجّو نے ڈرتے ڈرتے اپنی صفائی پیش کرنی چاہی —— مگر بدتمیز چنو اور منے اپنی ہیں ہیں ہیں کچھ سننے بھی دیں —— سارے گھر کے قہقہوں میں اس کی آواز ڈوب گئی —— اور پہلی بار مجّو کو معلوم ہوا کہ کسی کا کہنا نہ ماننے کا کیا انجام ہوتا ہے؟

شرط

اطہر پرویز

ایک دن گاؤں کے مدرسے میں چھٹی تھی آس پاس کے سب آدمی مدرسے کے برآمدے میں بیٹھے ہوئے تھے اور گپیں ہانک رہے تھے۔ کوئی کہتا تھا کہ ہمارے دادا کے پاس اتنا بڑا بانس تھا کہ جب بارش نہیں ہوتی تھی تو وہ آسمان میں سوراخ کر دیتے تھے۔ سوراخ ہوتے ہی وہ موسلا دھار بارش ہوتی کہ سارا شہر پانی سے بھر جاتا۔ آخر شہر کے لوگ پھر ہمارے دادا کے پاس جمع ہوتے اور کہتے کہ کسی طرح آسمان کا سوراخ بند کر دیجیے تو ہمارے دادا کوئی ٹوٹا ہوا تارا لے کر آسمان میں چپکا دیتے۔ تب کہیں جاکر سوراخ بند ہوتا۔

ایک اور گپّی بھی تھے وہ کہتے کہ ہمارے نانا کے پاس ایک ایسا جوتا تھا جس کو پہن کر سارا خاندان ایک وقت میں چل سکتا تھا۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ چھٹی کا دن سب اسی طرح اپنے باپ دادا کی کہانیاں کہہ کہہ کر گذار رہے تھے۔ اس مجمع میں جگت چچا بھی تھے جن کو سارے گاؤں کے لوگ چچا کہتے تھے۔ چچا بھی اسی طرح کی کہانیاں سنتے رہے جب سب اپنی اپنی کہہ چکے تو ان کو بھی جوش آگیا وہ بڑے مزے میں بولے۔ "واہ بھئی واہ" اماں، باپ دادا جو تھے سو تھے تم تو اپنی کہو" یہ سُن کر سب کو غصہ آگیا اور انہوں نے کہا "چچا کیا تم بڑھ بڑھ کر باتیں مار رہے ہو۔ بھلا تم کیا جانو کہ ہم خاندانی آدمی ہیں۔ ہمارے باپ دادا تمہاری طرح کوئی گھاس تھوڑے ہی کھودتے تھے۔"

یہ سننا تھا کہ چچا کو بہت غصہ آیا اور بولے "کیوں بیکار کے لئے میرے منہ لگتے ہو۔ تمہارے باپ دادا نے عیش کیے ہوں گے۔ یہاں میں خود عیش کرتا ہوں۔ گاؤں میں کون ہے جس کے ساتھ میرا اٹھنا بیٹھنا نہیں ہے۔" اس پر گاؤں کے بڑے ساہوکار لالہ رام چندر کو بھی تاؤ آگیا اور وہ بولے "اچھا چچا! اگر یہ سچ ہے تو پھر ذرا تم اپنے علاقے کے زمیندار کے ساتھ کھانا کھا کر ہی دکھا دو" چچا نے کہا "واہ یہ بھی کوئی بات ہے لیکن میں کیوں اپنا وقت خراب کروں۔"
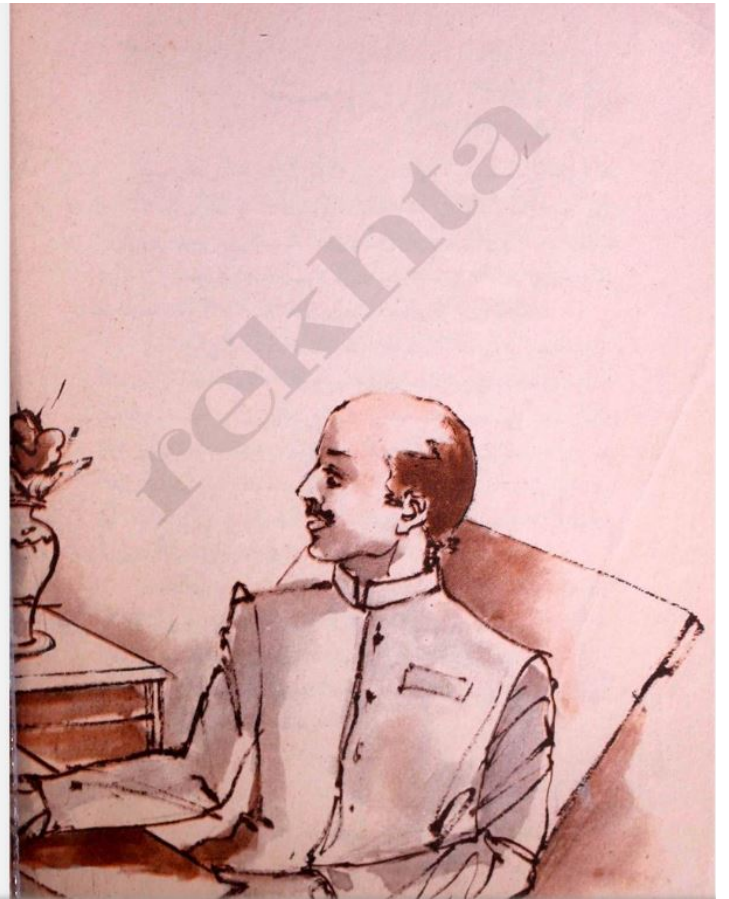
لالہ جی نے کہا" نہیں تم کھا کر دکھاؤ میں ایک ہزار کی شرط لگانے کے لئے تیار ہوں ۔"

چچا مسکرائے اور بولے ۔" اچھی بات ہے یہی سہی لیکن تم اپنی بات پر قائم بھی رہوگے ۔"

لالہ جی بات کے دھنی تھے بولے :" اچھی بات ہے یہی سہی ، اتنے آدمی گواہ ہیں ، اگر آج تم کھانا کھالو زمیندار کے ساتھ ۔" جب بات پکی ہوگئی تو شام کو چچا زمیندار کے پاس پہنچے اور بولے" زمیندار صاحب ! ذرا ایک بات تو بتانا ۔ مگر بات تو ایسی ہے کہ کانوں کان خبر نہ ہو ۔"

زمیندار صاحب بولے :۔" ایسی کون سی بات ہے ۔ ذرا میں بھی تو سنوں ۔"

چچا نے کہا :۔" بھائی بات تو بڑی ہے لیکن کسی اور کو نہ معلوم ہو تو میں سنا دوں ۔"

جب زمیندار صاحب نے وعدہ کیا تو چچا نے کہا" زمیندار صاحب ! مجھے سونے کی اشرفی کے دام بتا دیجیے اور اگر آدھے دام پر خریدنے کے لئے کوئی آدمی مل جائے تو اس کا نام بھی بتا دیجیے ۔"

زمیندار صاحب بہت خوش ہوئے اور بولے :" ارے بھائی یہ بھی کوئی بات ہے میں دام بتا دوں گا تم بے فکر رہو ۔"

زمیندار صاحب نے سوچا کہ اچھا خاصا سودا پٹ رہا ہے کسی طرح چچا کو راضی کرلیں ۔

چچا نے کہا " میں رات کو کھانا کھانے کے بعد آؤں گا تو بات ہوگی ۔"

زمیندار صاحب نے کہا" بھیا تم کھانا تو میرے ساتھ کھانا اور اب کھانے پر ہی باتیں ہوں گی ۔"

رات کو چچا زمیندار صاحب کے یہاں پہنچے اور وہاں انہوں نے ڈٹ کر کھانا کھایا کھانے کے بعد جب زمیندار صاحب نے کہا" بھائی وہ سونے کی اشرفی تو دکھانا" چچا نے کہا " زمیندار صاحب میں نے یہ کب کہا تھا کہ میرے پاس سونے کی اشرفی ہے میں تو صرف دام پوچھ رہا تھا ۔" یہ سُن کر زمیندار صاحب کو بہت غصہ آیا اور انہوں نے کہا" بیوقوف کہیں کے میرا اتنا وقت خراب کیا نکل جاؤ یہاں سے ۔"

چچا مسکرائے اور بولے" میں کیسے بیوقوف ہوں خود سوچیے کہ آپ نے خود مجھے کھانا کھلایا ہے اور گاؤں کے بڑے لالہ رام چندر ۔ مجھے آپ کے یہاں کھانا کھانے پر ایک ہزار روپیہ دینے والے ہیں ۔ میں آپ کے ساتھ کھانا کھا کر ایک شرط جیت چکا ہوں ۔" زمیندار صاحب کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا وہ خود کو بہت عقل مند

سمجھتے تھے مگر اُنہیں کیا معلوم تھا کہ کبھی کبھار کوئی بیوقوف نظر آنے والا شخص بھی عقل مندوں کو بیوقوف بنا سکتا ہے ۔

لیٹر بکس

رام لعل

ونود، وجے اور بندی تین گہرے دوست تھے۔ اور تینوں تھے بے حد شرارتی، ان کی کوئی بات شرارت سے خالی نہیں ہوتی تھی۔

ایک بار انہوں نے پرانے اخباروں کو تازہ بنا کر کئی لوگوں کے ہاتھ بیچ ڈالا اور پھر بھاگ گئے۔ اور ایک دفعہ تو انہوں نے محلے کے ایک ڈاکٹر کی بھی خبر لے لی جو انہیں بیمار پڑ جانے پر سخت کڑوی دوائیں پلاتا تھا۔ انہوں نے محلے کے سب بچوں میں اُس ڈاکٹر کے خلاف پروپیگنڈہ کر دیا
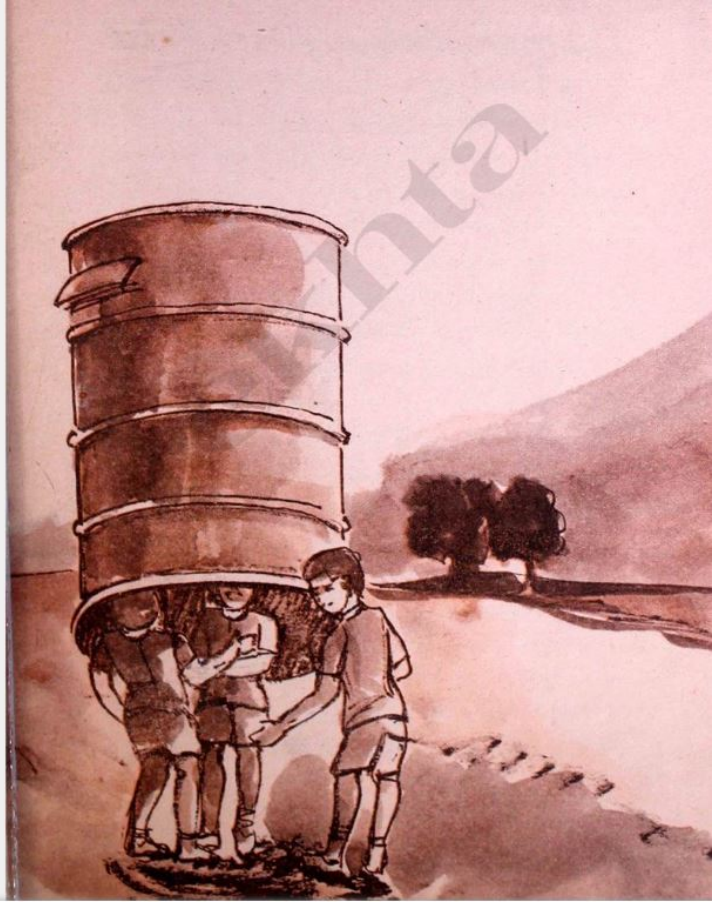
جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بچے بیمار پڑنے پر اُس کے پاس جانے سے انکار کرنے لگے اور اُن کے ماں باپ کو بھی بہت پریشانی کا سامنا کرنا پڑا تینوں دوست اپنی ایسی شرارتوں کی وجہ سے محلے بھر میں مشہور تھے۔ چھٹیوں میں تو انہیں اور زیادہ شرارتیں سوجھتی تھیں۔

ایک دن سڑک سڑک پر جاتے جاتے ایک ٹرک الٹ گیا۔ اُس میں لدے ہوئے سرخ روغن کے کچھ ڈرام نیچے گر کر پھٹ گئے اور روغن اِدھر اُدھر پھیل گیا۔ ایک جگہ ایک گڑھے میں بھی روغن جمع ہو گیا۔ شام کو اندھیرا ہو جانے پر تینوں دوست سڑک کی مرمت کے لیے رکھا ہوا تارکول کا خالی ڈرام لڑھکا کر لے آئے جہاں گڑھے میں سرخ روغن بھرا ہوا تھا۔ سارا روغن اُس ڈرام پر مل دیا۔ جب ڈرام ہر طرف سے سرخ رنگ میں رنگ لیا گیا تو اُس میں ایک جگہ کاٹ کر منہ بنایا۔ ایک دکاندار سے تھوڑا سا سفید روغن لے کر ڈرم پر لکھ دیا "لیٹر بکس" اور اسے لڑھکا کر ایک گلی کے سرے پر اس طرح رکھ دیا جس کے اندر نیچے سے وہ خود بھی گھس کر بیٹھ سکتے تھے۔

دوسرے دن صبح سویرے وہ تینوں اُس میں جا کر بیٹھ گئے اور اُس میں خط ڈالنے والوں کا انتظار کرنے لگے ایک آدمی نے ڈاک ڈالنے کا نیا ڈبہ دیکھ کر دوسرے آدمی سے کہا "ڈاک خانے والوں نے یہاں پر یہ ڈبہ رکھ کر بہت اچھا کام کیا ہے اب خط ڈالنے کے لیے بہت دور نہیں جانا پڑے گا۔"

تھوڑی دیر بعد ایک آدمی نے وہاں آ کر خط ڈالا۔ اس کے خط میں جو باتیں لکھی ہوئی تھیں اُسے پڑھ کر تینوں دوست حیران رہ گئے۔ تھوڑی دیر تک آپس میں کچھ صلاح و مشورہ کیا اور پھر ڈرم میں سے باہر نکل آئے۔

اس کے بعد دو دن تک ونود، وجے اور نندی اپنے بنائے ہوئے لیٹر بکس کے پاس نہ گئے دراصل بات یہ تھی کہ اُس خط نے اُنہیں ایک بہت ہی عجیب الجھن میں ڈال دیا تھا۔ وہی خط جسے پڑھ کر وہ حیران رہ گئے تھے۔ دو دن تک وہ سوچتے رہے اور تجویزیں بناتے رہے۔ تیسرے دن صبح سویرے وہ تینوں اپنے لیٹر بکس کے پاس گئے۔ اس کے اندر بہت سے خط بھرے پڑے تھے۔ لیکن انہیں اب اتنے سارے خط پڑھنے کی فرصت نہیں تھی۔ جتنے خط انہیں ملے سب کو نکال کر

دوسرے اصلی لیٹر بکس میں جا کر ڈال آئے اور اپنے لیٹر بکس کو لڑھکاتے ہوئے پولیس کے تھانے میں لے گئے اور سپاہیوں کے لاکھ منع کرنے کے باوجود وہ سیدھے داروغہ صاحب کے کمرے میں چلے گئے۔ لیٹر بکس اب بھی ان کے ساتھ تھا جسے دیکھ کر داروغہ کو بہت غصہ آیا اور اپنے سپاہی سے بولا۔ "تم نے انہیں میرے پاس آنے کی کیوں اجازت دی؟" سپاہی کے جواب دینے سے پہلے ہی ونود بول اٹھا ——— "داروغہ صاحب اب زیادہ وقت ضائع نہ کیجیے ہمارے لیٹر بکس سے ملاقات کیجیے یہ آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔" "کیا کہنا چاہتا ہے؟" داروغہ اب سخت غصے میں آ گیا تھا لیکن ونود، وجے اور بندی میں سے کوئی نہ گھبرایا اور تینوں لیٹر بکس کے اندر گھس کر بولے۔

"اپنا کان قریب لائیے۔"

داروغہ بڑبڑاتے ہوئے اپنا کان لیٹر بکس کے منہ کے پاس لے گیا تو ان تینوں نے اُسے ایک بات سنائی جسے سُن کر داروغہ حیران رہ گیا پھر خوش ہو کر بولا "جلدی سے باہر نکل آؤ۔"

داروغہ نے کہا "اگر یہ بات غلط ہوئی تو میں بہت کڑی سزا دوں گا۔"

تینوں دوست ایک ساتھ بولے "بے شک!"

اس کے بعد داروغہ نے فوراً پولیس کی بس بلوائی! اس میں بہت سے سپاہی بندوقیں لے کر بیٹھ گئے۔ اگلی سیٹوں پر ڈرائیور کے ساتھ داروغہ اور ونود، وجے اور بندی بیٹھے لیٹر بکس کو بس کی چھت پر رکھ لیا گیا۔ شہر کے ایک دوسرے حصے میں پہنچ کر بس روک لی گئی۔ تمام سپاہی ایک مکان میں جا کر بیٹھ گئے۔ ونود، وجے، بندی اور داروغہ لیٹر بکس میں بیٹھ گئے۔ لیٹر بکس اتنا بڑا تھا کہ چاروں اُس کے اندر آسانی سے بیٹھ گئے۔ بس کا ڈرائیور داروغہ کا حکم پا کر لیٹر بکس کو لڑھکاتا ہوا ایک خاص بتائی ہوئی جگہ پر جا کر رکھ آیا۔ لیٹر بکس کو دیکھ کر کسی کو حیرت نہ ہوئی بلکہ سب خوش ہوئے کہ اب انہیں خط ڈالنے کے لیے بہت دور نہیں جانا پڑے گا۔

اُن کے دیکھتے دیکھتے کتنے لوگوں نے اپنے خط اُس کے اندر ڈال دیے لیکن لیٹر بکس کے اندر بیٹھے ہوئے آدمیوں کو ان خطوط سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ تو لیٹر بکس کے سوراخ میں سے سامنے

کے مکان پر نظر جمائے ہوئے بیٹھے تھے جہاں تھوڑی دیر میں ایک بارات آنے والی تھی۔ دروازے پر پھول اور پتے لٹک رہے تھے اور لاؤڈ اسپیکر سے گانے سنائے جا رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد وہاں دس پندرہ آدمیوں کی بارات آگئی۔ آگے بینڈ باجا بج رہا تھا۔ جب سب لوگ مکان کے اندر چلے گئے تو داروغہ اور تینوں دوست باہر آگئے۔ داروغہ نے وسل بجا کر سب سپاہیوں کو وہاں بلوایا جو تھوڑی دور ایک مکان کے اندر چھپے ہوئے تھے۔

سپاہیوں کے آتے ہی داروغہ نے بارات والے مکان پر ہلّہ بول دیا اور اندر جا کر سب براتیوں اور گھر والوں کو گرفتار کر لیا۔ اُن لوگوں نے بہت ناراض ہو کر کہا "ہماری شادی میں آپ لوگ ایسا کیوں کرتے ہیں؟" داروغہ نے پستول دکھا کر کہا "لیکن یہ تو بتائیے دلہن اور اُس کے گھر والے کہاں ہیں؟"

وہ لوگ کوئی جواب نہ سکے کیونکہ وہاں سچ مچ کوئی دلہن نہ تھی۔ وہ لوگ تو بارات کا بہانہ بنا کر وہاں رکھا ہوا لوٹ مار کا بہت سا مال اور روپیہ اٹھانے آئے تھے اور یہ بات ونود، وجے اور بندی کو اُس خط کے پڑھنے کے بعد معلوم ہوئی تھی جو انہوں نے اپنے سردار کو لکھی تھی۔ ڈاکوؤں کو اتنی کامیابی سے پکڑوانے کے بعد تینوں دوستوں کو بہادر کا خطاب دیا گیا تھا اور سرکار کی طرف سے
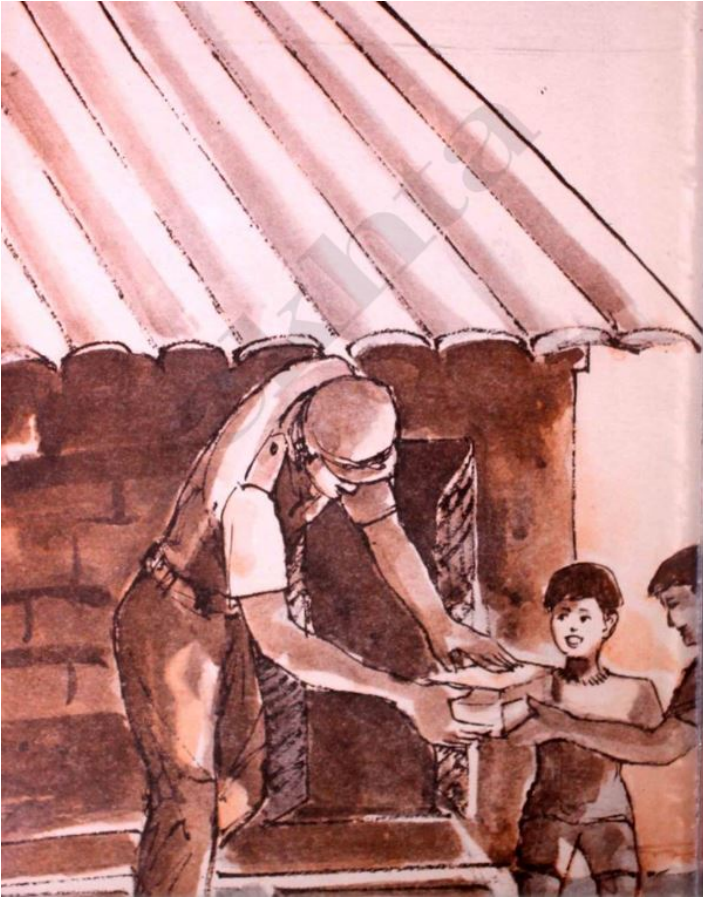
بہت سا انعام دیا گیا اور اُن کے لیٹر بکس کو سرکاری عجائب خانے میں داخل کر لیا گیا۔

نمک کا تھیلا

انور کمال حسینی

ایک مرتبہ شیر، چیتا، زیبرا، سانپ، سارس اور ریچھ نے ایک جگہ اکٹھے ہو کر ادھر اُدھر کی باتیں کیں اور باتیں کرنے کے بعد وہ پانی پینے کے لیے ندی کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں شیر کی نگاہ کسی چیز پر پڑی۔ وہ ایک چھوٹا سا تھیلا تھا جو زمین پر پڑا ہوا تھا۔

"وہ دیکھ، ایک تھیلا۔" شیر نے کہا۔

چیتے نے اُس تھیلے کو دیکھ کر کہا۔ "نمک کی خوشبو معلوم ہوتی ہے!"

ریچھ نے تھیلے کو کھولنے کی کوشش کی مگر وہ کامیاب نہ ہو سکا۔

سارس کو اپنی لمبی چونچ سے تھیلے میں سوراخ کر دینا چاہیئے۔" زیبرا نے کہا۔

"سارس نے تھیلے میں سوراخ کر دیا اور تب سانپ نے آگے بڑھ کر نمک کا مزہ چکھا اور کہا۔

"بے شک یہ نمک ہے۔"

اِس کے بعد اُن سب نے نمک چکھا کیونکہ جنگل میں نمک کہیں نہیں ملتا تھا اس لیے وہ اُسے پاکر بہت خوش ہوئے اور انہوں نے سوچا کہ اب روز وہ نمک کا مزہ لیا کریں گے۔ سب سے پہلے شیر نے دھاڑ کر کہا۔

"نمک میرا ہے کیونکہ میں نے اِسے سب سے پہلے دیکھا ہے۔"

"نہیں یہ میرا ہے، کیونکہ میں نے سونگھ کر بتایا تھا کہ اس میں نمک ہے۔" چیتے نے شیر کو غصے سے گھورتے ہوئے کہا۔

"لیکن بھائی یہ میرا کیوں نہیں ہے؟" ریچھ نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ "کیا میں نے تھیلا کھولنے کی کوشش نہیں کی تھی؟"

"مگر تم ناکام رہے تھے"۔ زیبرا نے کہا۔ "جناب یہ میں تھا جس نے سارس سے تھیلے میں سوراخ کرنے کو کہا تھا۔ اِس لیے نمک میرا ہونا چاہیئے۔"

"اوہو! ــ سوراخ میں نے کیا اور مالک آپ بن رہے ہیں؟" سارس نے کہا۔ "نمک میرا ہے اور صرف میرا ہے۔"

"نہیں نہیں!" سانپ نے پھنکار مارتے ہوئے کہا۔ "میں نے نمک کا ذائقہ چکھ کر بتایا تھا اور اگر تم میں سے کسی نے بھی گڑبڑ کرنے کی تو اس کو ڈس کر ختم کر دوں گا۔"

اس کے بعد ان جانوروں کی آپس میں لڑائی ہونے لگی اور کسی طرح ختم ہونے میں نہ آئی تو اتفاق سے ایک گیدڑ اُدھر آنکلا اور اُس نے اُن سے پورا واقعہ پوچھا۔ شیر نے شروع سے آخر تک پوری کہانی سنا دی۔ گیدڑ نے خاموشی سے قصّہ سُنا اور پھر کہا۔

"دیکھو بھائیو! میں ایک ترکیب بتاتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ تم سب آنکھیں بند کر کے کھڑے ہو جاؤ اور پھر سو تک گنتی گنو۔ اتنی دیر میں میں تھیلے کو چھپا دوں گا۔ پھر جو سب سے پہلے اُسے تلاش کر لے گا بس وہی اُس کا مالک ہوگا۔"

یہ سُن کر سب جانور راضی ہو گئے اور انہوں نے آنکھیں بند کر لیں۔ سو تک گنتی گننے کے بعد انہوں نے اپنی آنکھیں کھولیں اور تھیلا تلاش کرنا شروع کر دیا مگر تھیلے کو نہ ملنا تھا نہ ملا۔ آخر وہ تھک گئے اور انہوں نے گیدڑ کو آواز دی تاکہ اُسی سے تھیلے کا پتہ معلوم کر کے ڈھونڈھ لیں۔ مگر آپ گیدڑ وہاں کہاں رکھا تھا؟ وہ تو اپنی کھوہ میں بیٹھا ہوا نمک کے چٹخارے لے رہا تھا اور جنگل کے "چھ بڑے بیوقوفوں" کا مذاق اڑا رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا:-

"اگر وہ جانور اتفاق سے رہتے اور نمک کے چھ برابر حصّے کر لیتے تو نمک سے ہاتھ نہ دھوتے۔ اور اگر مجھ کو جج نہ بناتے تو میں اُن کے پورے نمک پر قبضہ کیسے کرتا؟"

اُدھر اُن چھ بڑوں نے ارادہ کر لیا کہ اگر گیدڑ کبھی اُن کے سامنے پڑ گیا تو وہ اُس کو زندہ نہیں چھوڑیں گے مگر گیدڑ بعد میں کبھی ان کے سامنے آیا ہی نہیں اور وہ نمک کی خواہش کرتے کرتے ہی مر گئے۔

بچّو! اگر وہ جانور اتفاق سے رہتے اور میل جول سے نمک کے چھ حصے کر لیتے تو انہیں یہ دن دیکھنا نہ پڑتا اور وہ بڑے فائدے میں رہتے اور ایک بزدل جانور اُن کو بیوقوف نہ بناتا۔ اِس لیے تم بھی میل جول سے رہنا چونکہ اتفاق میں بڑی طاقت ہے۔

بدلہ

خلیق انجم اشرفی

جاڑے کے دن تھے اور رات کا وقت۔ ہم لوگ لحافوں میں سکڑے سمٹے پڑے تھے۔ اسٹوو پر چائے کا پانی سنسنا رہا تھا اور رعنا ابا جان سے کہانی سنانے کی ضد کر رہی تھی۔

آخر ابا جان کو اس کی ضد کے آگے ہار ماننی ہی پڑی۔ گرم گرم چائے کے گھونٹ بھرتے ہوئے انہوں نے کہنا شروع کیا۔

"اچھا تو لو بیٹی، آج ایک سچی کہانی سنو، بالکل آنکھوں دیکھی۔"

اتنا سن کر ہم لوگوں کا اشتیاق بڑھ گیا اور ہم سب پوری طرح ابا جان کی طرف متوجہ ہو گئے۔

وہ تھوڑی دیر رک کر کہنے لگے۔

"جیسا کہ تم لوگوں کو اچھی طرح معلوم ہے، میں بھی دوسری جنگ عظیم میں شرکت کر چکا ہوں اُن دنوں ہماری فوج مصر میں پڑاؤ ڈالے ہوئے تھی۔ ایک دن جرمن سپاہیوں سے مقابلے میں زخمی ہونے کے بعد مجھے مصر کے فوجی اسپتال میں داخل کرا دیا گیا۔ ان دنوں فوجی اسپتال زخمیوں اور بیماروں سے بھرے رہتے تھے۔ میں جس کمرے میں تھا اس میں میرے علاوہ تین مریض اور بھی تھے۔ میرے بستر کے پاس ہی ایک انگریز فوجی افسر البرٹ کا بستر تھا۔ اسے دمے کا مرض تھا۔ دمے کی اس تکلیف کی وجہ سے اور کچھ اپنی سخت مزاجی کی وجہ سے وہ بہت چڑچڑا ہو گیا تھا۔ ہماری تیمار دار
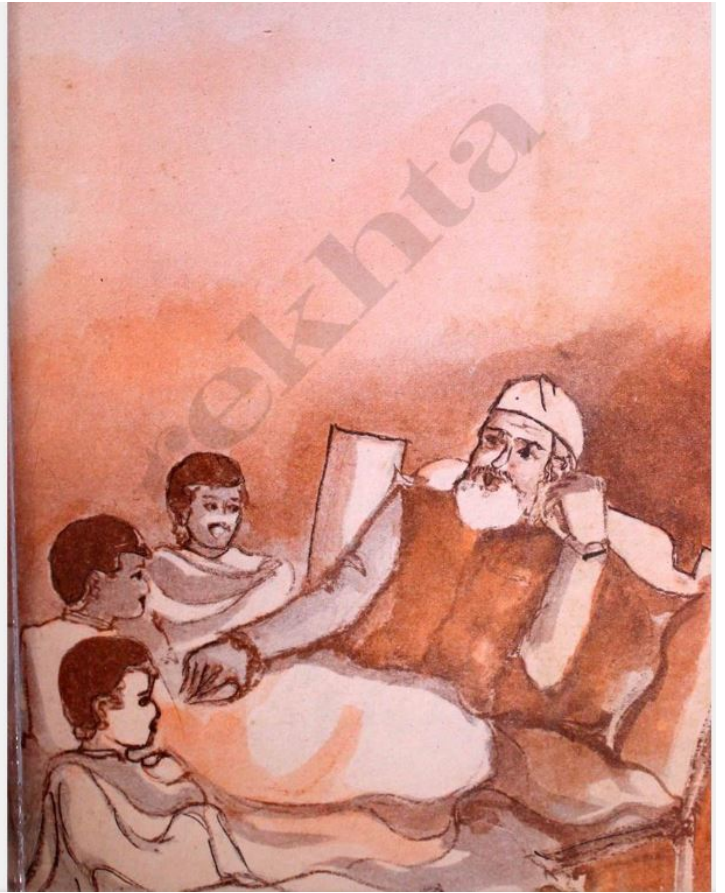
ایک ہنس مکھ نرس جوزیفائن تھی۔ غصہ میں تو اسے کبھی دیکھا ہی نہیں۔ ہر وقت فرشتوں جیسی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر کھیلتی رہتی۔ وہ صرف اپنی ڈیوٹی ہی پوری نہیں کرتی تھی بلکہ مریضوں کو لطیفے اور دلچسپ واقعات سنا کر ان کے مرض کی تکلیف اور دُکھ کے احساس کو کم کرنے کی بھی کوشش کرتی۔ تمام مریض اس سے بے حد خوش تھے۔ ناخوش تھا تو وہ فوجی افسر البرٹ جو ہر ایک سے غصے
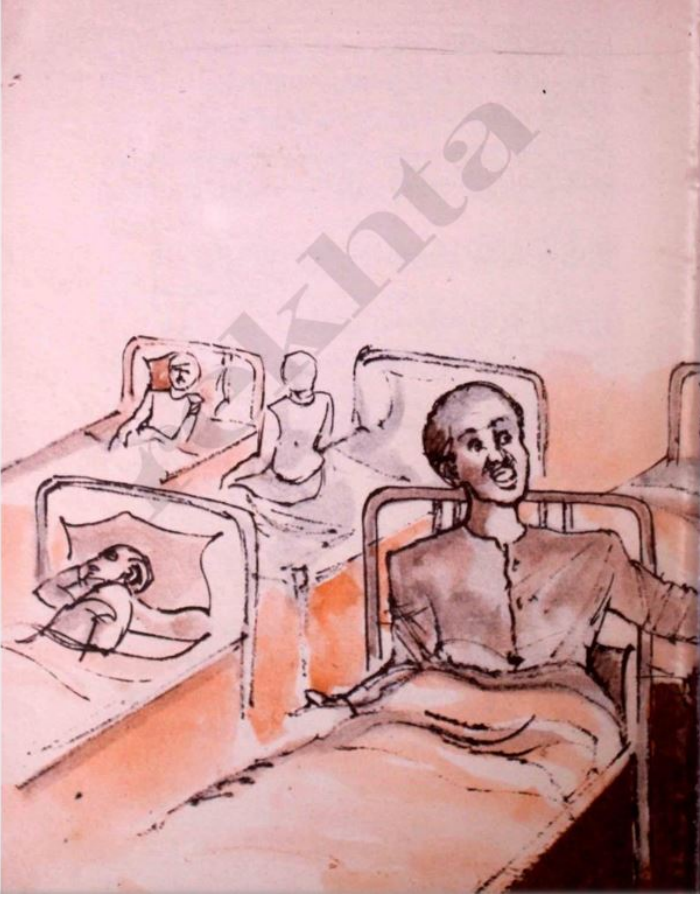
میں چیخ کر بات کرنے کا عادی ہوچکا تھا۔ وہ بات بات پر جوزیفائن کو جھڑک دیا کرتا مگر اس خوش اخلاق نرس کے ماتھے پر بل نہ آتا بلکہ وہ اس کی اور خدمت کرتی کیونکہ وہ اس کے چڑچڑے پن کی وجہ سے واقف تھی۔ میرا زخم بہت معمولی تھا۔ میں جلدی اچھا ہوگیا۔ جس دن مجھے ڈسچارج ہونا تھا، جوزیفائن صبح سے ضروری خانہ پری میں مصروف تھی۔ البرٹ نے اسے دو دفعہ پکارا مگر وہ اپنے کام میں اتنا کھوئی ہوئی تھی کہ اس کی بات نہ سُن سکی۔ یہ دیکھ کر البرٹ جھنجھلا گیا اور چیخ کر بولا "بہری ہوگئی ہے کیا؟"

جوزیفائن چونک کر مڑی اور پھر جلدی سے دوڑ کر البرٹ کے پاس پہونچی اور بڑی نرمی سے پوچھا "کیا چاہیئے مسٹر البرٹ؟"

"ہوں کیا چاہیئے!" البرٹ غصے میں اسی کے الفاظ دہراتا ہوا بولا۔ "اتنی دیر سے چیخ رہا ہوں اور تو ہے کہ سنتی ہی نہیں" نرس کو اس کی اس بدتمیزی پر بھی غصہ نہ آیا، مسکرا کر بولی۔

"اوہ مسٹر البرٹ! میں ذرا کام کررہی تھی"

اس کی مسکراہٹ پر البرٹ بھڑک اٹھا اور اچانک نیچے رکھا ہوا شیشے کا اگالدان اٹھا کر اس کے منہ پر کھینچ مارا۔

"بیچاری نرس" رعنا بولی۔

"بھئی بولو مت! اس طرح کہانی کا مزہ کرکرا ہوجاتا ہے" میں نے اسے منع کیا اور ابا جان کی طرف متوجہ ہوکر بولا۔ "پھر کیا ہوا؟"

"پھر جیسے رعنا نے کہا بیچاری نرس کا سارا چہرہ خون اور تھوک سے تر ہوگیا۔ شیشے کے لگنے سے پیشانی پر بڑا سا زخم ہوگیا اور اس سے خون بہہ بہہ کر اُس کے چہرے کو بھگونے لگا۔ یہ واقعہ کچھ ایسے اچانک پیش آیا کہ میں کچھ نہ کرسکا۔ یہ دیکھ کر میں نے سوچا کہ اب یا تو جوزیفائن البرٹ کو غصے میں یقیناً کچھ کھینچ مارے گی ورنہ ڈاکٹر سے شکایت کرکے اس کو کچھ سزا تو ضرور ہی دلوائے گی مگر اس وقت میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ جوزیفائن کے چہرے پر ایک شکن نمودار

ہونے کے بعد پھر وہی فرشتوں جیسی مسکراہٹ آگئی اور وہ مسکرا کر بولی "ارے مسٹر البرٹ! آپ تو خفا ہوگئے چلیے زیادہ غصہ نہ کیجیے ورنہ آپ کو پھر کھانسی کا دورہ پڑ جائے گا۔"

یہ کہہ کر وہ مسکراتی ہوئی غالباً منہ دھونے اور زخم کی ڈریسنگ کرنے چلی گئی۔ میں دم بخود بستر پر بیٹھا جوزیفائن کے کردار کی بلندی پر غور کر رہا تھا اور البرٹ بالکل ہکابکا سا چھت کو تکے جا رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد جب جوزیفائن سر پر سفید پٹی باندھے کمرے میں داخل ہوئی تو البرٹ اچانک بستر سے اُتر کر جوزیفائن کے قدموں پر گر پڑا اور رو کر کہنے لگا "سسٹر مجھے معاف کردو۔ میں غصے میں اندھا ہوگیا تھا۔ تم بہت بلند ہو سسٹر اور میں بہت بدتمیز آدمی ہوں۔ مجھے معاف کردو سسٹر۔"

جوزیفائن کے چہرے پر پھر وہی فرشتوں جیسی مسکراہٹ آگئی۔ جیسے وہ اپنی انسانیت اور انتقام کے بدلے معاف کردینے پر نازاں ہو۔ جیسے وہ انسانیت کی اس جیت پر بہت خوش ہو۔ اس نے آہستگی سے البرٹ کو شانوں سے اٹھا کر کھڑا کردیا اور بڑے نرم لہجے میں بولی: "میں نے تمہیں معاف کردیا میرے بھائی!" یہ سن کر البرٹ کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آگئی اور میں اس منظر سے متاثر ہوکر کھڑکی کے پارک میں کھیلتے ہوئے معصوم بچوں کو دیکھنے لگا جن کے چہروں پر فرشتوں جیسا بھولا پن تھا اور جن کے ہونٹوں پر جوزیفائن جیسی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔"

اتنا کہہ کر ابا جان نے ایک لمبی سانس لی اور دوسری طرف کروٹ بدل لی ہم لحافوں میں دبے جوزیفائن کے کردار کی بلندی پر غور کر رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ ہمارے ساتھ ایسا واقعہ پیش آئے تو ہم کیا کریں گے؟ بدلہ لینا پسند کریں گے یا معاف کردیں گے!

پیتل کا لوٹا

م۔ ندیم

بہت دنوں کی بات ہے کسی شہر میں ایک مالدار آدمی رہتا تھا۔ اس کا نام فقیر چند تھا وہ شہر کا سب سے مالدار آدمی تھا، مگر ساتھ میں بڑا کنجوس مکھی چوس بھی تھا۔ اس کا حلیہ بھی عجیب تھا۔ باہر کو نکلتی ہوئی توند، چھوٹا سا قد، جب وہ چلتا تو معلوم ہوتا تھا کہ فٹ بال لڑھک رہی ہے۔ فقیر چند کی بیوی بہت اچھی عورت تھی وہ غریبوں کی مدد کیا کرتی تھی۔ منگل کے دن تو سیٹھ فقیر چند کی حویلی کے دروازے پر سارے شہر کے فقیروں اور اپاہجوں کا ہجوم رہتا تھا کیونکہ اُس دن سیٹھ کی بیوی ہر فقیر کو ایک پاؤ آٹا خیرات دیا کرتی تھی۔ سیٹھ جی کو یہ بات بہت بری لگتی تھی مگر وہ بیوی سے ڈرتے بھی تھے اس لیے کچھ کہتے بھی نہ تھے۔ ایک بار سیٹھ جی نے بیوی کو سمجھایا بھی تھا "ان فقیروں سادھوؤں کو خیرات دینے سے کوئی فائدہ نہیں یہ سب کام چور ہوتے ہیں۔ ہماری رحم دلی سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں، مفت خوری کرتے ہیں۔ آٹا بازار میں بیچ دیتے ہیں اور افیم کھاتے ہیں، دم لگاتے ہیں اور موج کرتے ہیں یعنی ہم سب کو بیوقوف بناتے ہیں۔" اس بات پر بیوی نے سیٹھ جی کو الٹی سیدھی سنائی تھی اور کہا تھا: "بھگوان نے جو ہمیں اتنی ساری دولت دی ہے وہ اسی خیر خیرات کا نتیجہ ہے۔" پھر اس نے سیٹھ جی کو ان کی غریبی کا زمانہ یاد دلایا تھا جب ان کے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی۔ سیٹھ جی کو اس بات سے سخت چڑھ تھی کہ کوئی ان کو اُن کا بیتا ہوا زمانہ یاد دلائے کہ وہ کیا تھے اور اب کیا ہیں۔ کیونکہ وہ اپنے کو خاندانی سیٹھ کہتے تھے اس لیے وہ چپ ہو رہے۔

دنیا کے دوسرے مالدار آدمیوں کی طرح سیٹھ فقیر چند کو بھی اپنی دولت بڑھانے کی فکر لگی رہتی تھی۔ ان کے گودام میں شکر، نمک، تیل، گیہوں، چاول اور دالوں کے انبار لگے رہتے تھے۔ وہ شہر کے سب سے بڑے تھوک بیوپاری جو تھے۔ جب قیمتیں بڑھتیں تو سیٹھ جی کا خون بڑھ جاتا اور اگر بھاؤ گھٹتا تو سیٹھ جی پریشان ہو جاتے۔ ان کی راتوں کی نیند حرام ہو جاتی۔ بھوک غائب ہو جاتی۔

ایک سال ایسا ہوا کہ ملک میں بارش نہیں ہوئی۔ قحط پڑ گیا۔ اناج بازار سے غائب ہوگیا اور غلّے کی قیمتیں بہت بڑھ گئیں۔ سیٹھ جی نے اناج کی فروخت بند کر دی کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اناج کی قیمتیں اور بڑھیں گی۔ منگل کے دن شہر کے فقیروں اور اپاہجوں کو جو آٹا ملا کرتا تھا وہ بھی ملنا بند ہوگیا۔

ایک دن صبح صبح جب سیٹھ جی ناشتہ کر کے آرام سے بیٹھے حقّہ پی رہے تھے ایک آدمی ان کے پاس آیا۔ اور ہاتھ جوڑ کر بولا: "سیٹھ فقیر چند جی، آپ کی دولت بڑھے۔ آپ کی صحت اچھی رہے۔ میں غریب آدمی ہوں۔ میرے بچے بھوکے مر رہے ہیں۔ مجھے چند سیر چنے دے دیجیے۔ میں چنے کھلا کر ان کا پیٹ بھر دوں گا اور آپ کو ساری زندگی دعائیں دوں گا۔"

سیٹھ کو بہت غصہ آیا اور انہوں نے اسے ڈانٹ پلائی اور بھگا دیا۔ دوسرے دن وہ آدمی پھر آیا۔ اس کے ہاتھ میں پیتل کا لوٹا تھا۔ سیٹھ جی نے اسے دیکھا تو غصے سے بولے: "اب کس لئے آئے ہو؟ میں تم کو ایک دانہ بھی نہیں دے سکتا۔ اپنی خیر چاہتے ہو تو یہاں سے فوراً نکل جاؤ ورنہ۔"

"مگر سیٹھ جی آپ ہی کے فائدے کی بات ہے۔" اس آدمی نے بات کاٹ دی۔ "آپ مجھے نہیں پہچانتے کوئی بات نہیں۔ کم از کم اس پیتل کے لوٹے کو تو پہچانتے ہی ہوں گے۔ اس پر آپ کا نام بھی کھدا ہوا ہے — فقیر چند ولد گھسیٹ چند — شاید آپ کو یاد ہو۔ جب آپ نئے نئے شہر میں آئے تھے تو یہ لوٹا راموبھڑ بھونجے کے پاس چار آنے میں گروی رکھا تھا اور آپ نے رسید بھی لکھ دی تھی۔ یہ بات ذرا پرانی ہے کوئی بیس سال پہلے کی۔ آپ اسے چھڑانا بھول گئے۔ خیر کوئی بات نہیں بڑے لوگوں کی یاد داشت ہمیشہ کمزور ہوتی ہے۔ میرا فرض تھا کہ میں آپ کی چیز کو واپس کر دوں۔ کیا خیال ہے کچھ یاد آیا آپ کو؟"

سیٹھ جی کا غصہ یہ سنتے ہی کافور ہو گیا۔ انہوں نے ادھر اُدھر دیکھا کہ کوئی ان کی بات چیت تو نہیں سُن رہا ہے۔ پھر کہنے لگے "ہاں ہاں۔ مجھے خوب یاد ہے۔ تم نے اچھا کیا میرا لوٹا لے آئے۔ میں ابھی تمہیں چار آنے دیتا ہوں، میرا لوٹا مجھے دے دو۔"

"ہاہا" رامو ہنسا۔ "سیٹھ جی آپ مذاق کر رہے ہیں۔ بیس سال میں دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ جب آپ کی جیب میں ایک پیسہ بھی نہیں تھا۔ آپ کا لباس ایک پھٹی دھوتی تھا۔ آپ کے پاس صرف ایک پیتل کا لوٹا تھا۔ آپ جب کنگال تھے۔ اب لکھ پتی ہیں۔ جب فقیر چند تھے اب سیٹھ فقیر چند ہیں۔ ذرا آپ ہی ایمانداری سے کہیے، اس نایاب پیتل کے لوٹے کی قیمت کیا چار آنے ہی رہے گی؟"

"اچھا تو میں اس کی قیمت پانچ روپے دوں گا۔ لاؤ میرا لوٹا مجھے واپس کر دو۔"

رامو نے اس لوٹے کو انگلیوں پر نچاتے ہوئے کہا۔ "دیکھیے اس پر آپ کا نام بھی لکھا ہے۔ آپ نے جو رسید لکھی تھی اس پر آپ کے دستخط بھی ہیں وہ بھی میرے پاس محفوظ ہے۔ میں سوچتا ہوں اس لوٹے کو بازار میں نیلام کر دیا جائے۔ آپ بھی وہیں قیمت لگائیے۔ بھلا سیٹھ فقیر چند کا لوٹا! اس کی قیمت تو ایک ہزار بھی کم ہے۔ ایک۔ دو۔ تین۔۔۔۔ سیٹھ فقیر چند کا گروی رکھا ہوا پیتل کا لوٹا پھر سارا شہر جان لے گا کہ سیٹھ فقیر چند بیس سال پہلے کیا تھے۔ اچھا سیٹھ فقیر چند جی اب میں چلتا ہوں۔ آپ کا لوٹا میرے پاس حفاظت سے رہے گا۔" یہ کہہ کر رامو دروازے پر سے نکل کر یہ جا وہ جا۔ سیٹھ اُسے بلاتے ہی رہ گئے۔ مگر وہ نہ رُکا۔

سیٹھ جی کو سکتہ سا ہو گیا۔ بھوک غائب نیند کوسوں دور۔ ان کو رہ رہ کر یہ خیال پریشان کر رہا تھا کہ اگر اس رامو بھڑ بھونجے نے ان کا راز فاش کر دیا تو کیا ہوگا۔ ان کی ساری عزت خاک میں مل جائے گی۔ لوگ کیا کہیں گے۔ سیٹھ فقیر چند جس کو لوگ جھک کر سلام کرتے ہیں، جس کا لاکھوں روپیہ بینک میں جمع ہے۔ جس کی عزت سارے شہر میں ہے، وہ ایسا غریب آدمی تھا کہ پیتل کا لوٹا ایک بھڑ بھونجے کے پاس گروی رکھا ہے؟ سیٹھ کو اپنے اوپر غصہ آ رہا تھا۔ مگر سچ بات تو یہ تھی کہ انہیں کیا پتہ تھا کہ بیس سال بعد وہ لکھ پتی بن جائیں گے۔

بیس سال پہلے سیٹھ فقیر چند واقعی غریب آدمی تھے وہ اپنے گاؤں سے نوکری کی تلاش میں شہر آئے۔ جیب میں پھوٹی کوڑی نہ تھی۔ کسی طرح پیدل سفر کرتے کرتے شہر تک آ گئے تھے۔ نئی جگہ جان نہ پہچان بھوک نے الگ پریشان کیا۔ ناچار ہو کر ایک ترکیب سمجھ میں آئی۔ انہوں نے اپنا پیتل کا لوٹا گروی رکھا اور چار آنے کی رسید لکھ دی۔ دو پیسے کے چنے لیے اور پیٹ بھرا۔

پھر فقیر چند کو ایک سیٹھ کے یہاں منیم گیری کی نوکری مل گئی۔ یہ سچ ہے کہ فقیر چند نے اتنی محنت اور ایمانداری سے کام کیا کہ سیٹھ کا اعتبار ان کو حاصل ہو گیا۔ تجوریوں کی چابیاں ان کے قبضہ میں رہنے لگیں۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ سیٹھ اچانک بیمار پڑے اور دیکھتے ہی دیکھتے ختم ہو گئے۔ فقیر چند کی نیت میں فتور آ گیا۔ تجوری کھول کر انہوں نے ایک تھیلی نکال کر چھپا دی۔ کسی کو خبر بھی نہ ہوئی۔ سیٹھ کی موت کے بعد دولت کی تقسیم کے معاملے پر ان کے لڑکوں میں جھگڑا چلا۔ فقیر چند کام سے الگ ہو گئے۔ شہر کے ایک کونے میں چھوٹی سی دکان کھول کر بیٹھ گئے۔ رفتہ رفتہ دکان بڑھی اور فقیر چند سیٹھ فقیر چند بن گئے۔

سوچ سوچ کر سیٹھ جی ہار گئے۔ آخر ان سے نہ رہا گیا۔ دوسرے دن سویرے ہی وہ رامو بھڑ بھونجے کی دکان پر پہونچے۔ دیکھا تو ان کا لوٹا رسّی سے بندھا ہوا چھپر میں لٹک رہا تھا۔ سیٹھ جی کو دیکھ کر رامو مسکرایا اور بولا "نمستے سیٹھ جی! آپ نے ناحق تکلیف کی۔ میں خود حاضر ہو جاتا بتائیے میرے لیے کیا سیوا ہے؟"

سیٹھ کار سے اترے اور رامو کے ساتھ اس کے ٹوٹے پھوٹے گھر میں گئے۔ رامو نے ان کو چارپائی پر بٹھایا۔ خود زمین پر بیٹھا۔ سیٹھ کو رامو کا گھر اور اس کا حلیہ دیکھ کر اپنی بیس سال پہلے کی زندگی یاد آ گئی۔ جب ان کی حالت بھی تقریباً ایسی ہی تھی۔

"رامو میں تم کو ایک ہزار روپیہ دوں گا۔ میرا لوٹا مجھے دے دو۔"

"سیٹھ جی آپ کا لوٹا آپ کے قدموں پر حاضر کر دوں گا۔ مجھے ایک پیسہ بھی نہیں چاہیے۔ آپ کی دولت آپ کو مبارک۔ میں اتنا ہی کہوں گا کہ آپ بھی کبھی غریب تھے۔ یعنی ہماری ہی برادری کے ایک معمولی سے آدمی۔۔۔۔۔ آج آپ بڑے آدمی ہیں۔ اپنے آپ کو اور اپنے بھائیوں کے دُکھ درد کو

بھول گئے ہیں۔ آپ کے گوداموں میں غلہ پٹا پڑا ہے۔ ان گنت انسان بھوکوں مر رہے ہیں۔ آپ اگر چاہیں تو بھوکے مرتے انسان بچ سکتے ہیں - آپ کو اپنی عزت کی فکر ہے، بھوکے مرتے انسانوں کی نہیں۔"

"تو تم کیا چاہتے ہو؟"

"میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ مرتے ہوئے انسانوں کو بچایئے۔ اسی میں سچی خوشی ہے۔ یہ آپ کا فرض بھی ہے۔ میں آپ کا لوٹا نیلام کر سکتا ہوں مگر میں اتنا ذلیل آدمی نہیں۔ غریب ضرور ہوں۔

آپ کو لوٹے کی کتنی فکر ہے یہ آپ کے چہرے سے ظاہر ہے۔ کاش آپ کو اتنی ہی غریبوں کی فکر ہوتی۔"

"بس کرو رامو، بس کرو۔ تم سچ کہتے ہو، تم نے میری آنکھیں کھول دیں۔ میں ایک ایک دانہ مفت بانٹ دوں گا۔" یہ کہہ کر سیٹھ جی اٹھ کھڑے ہوئے۔

ایک ہفتے تک سیٹھ فقیر چند جی کے گوداموں سے جنتا کو مفت غلّہ بٹتا رہا۔ یہی نہیں سیٹھ جی نے کئی ہزار کی رقم اور کپڑا مفت غریبوں میں تقسیم کرنے کے لیے بھی دیا۔ پھر شہر کے دوسرے آدمیوں نے بھی سیٹھ کی دیکھا دیکھی ایسا ہی کیا۔

سیٹھ کی بیوی اور دوسرے لوگ سیٹھ کی دریا دلی پر حیران تھے مگر یہ بات صرف رامو جانتا تھا کہ یہ ساری کرامت پیتل کے لوٹے کی تھی۔

بانسری کا سُر

ابرار محسن

بھولا چرواہا گاؤں والوں کی آنکھوں کا تارا تھا۔ اس کا باپ بھی چرواہا تھا۔ بیس تیس بھیڑیں تھیں جن کی اون بازار میں بیچ کر دال روٹی چل جاتی تھی۔ بچپن ہی میں باپ کے ساتھ جا کر اس نے بھیڑیں چرانا سیکھ لیا تھا اور اس کام میں اُس کا پالتو کتا موتی بھی اُس کا ہاتھ بٹاتا تھا۔ بھٹکی ہوئی بھیڑوں کو لانا موتی ہی کا کام تھا۔ بھولا کو یہ زندگی بہت پسند تھی۔

ایک دفعہ گاؤں میں ایسی وبا پھیلی کہ اس کے ماں باپ دونوں ختم ہو گئے اور بھولا اکیلا رہ گیا۔ پو پھٹنے سے پہلے جب اندھیروں میں سویرے کی خوشبو بھر جاتی، گھروں میں چکیوں کی گھوں گھوں کی آواز جاگ اٹھتی، مرغ بانگ پر بانگ دینے لگتے اور باڑوں میں بھینسیں ڈکرانے لگتیں اس وقت وہ بھی اٹھ کر روٹی پکا کر چادر کے پلو میں باندھ لیتا اور بھیڑوں کو جنگل کی سمت ہنکاتا۔ وقت گذارنے کے لیے وہ باپو کی پرانی بانسری بھی ساتھ لے آتا۔ جنگل میں جا کر بھیڑیں موتی کی نگرانی میں چھوڑ دیتا اور خود پرانے برگد کے تنے سے ٹیک لگا کر سارا دن بانسری بجاتا رہتا، یہاں تک کہ دن ڈھلنے لگتا۔ اس وقت موتی بھیڑوں کو جمع کر لیتا اور بھولا دھول بھری پگڈنڈی پر بھیڑوں کو ہنکاتا ہوا واپس لے آتا۔ رات کے کھانے کے بعد چوپال پر لوگ اس کی بانسری سننے کے لیے جمع ہوتے۔ لوگ کہتے تھے کہ بھولا کی بانسری میں جادو بھرا تھا جسے سُن کر گاؤں کے لوگ اپنے سارے دُکھ درد اور ساری تھکن بھول جاتے۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ بانسری کے سُر نہ ہوں بلکہ کوئی آسمانی آواز ہو۔ اُسے سن کر بیمار بھیکو اپنا مرض بھول جاتا، بوڑھے گوپال دادا کی دھندلی آنکھوں میں چمک آجاتی۔ بھولا کو اس سے بڑی ہی خوشی ہوتی تھی۔ جب بھی وہ چوپال کی طرف جاتا بھیکو کھانسیوں کے درمیان کہتا: "ہاں بھولا! ذرا لگا تو بانسری ہونٹوں سے۔ آج کھانسی سے بڑی تکلیف ہے۔"

گوپال دادا لاٹھی ٹیکتے ہوئے آتے اور دور ہی سے کہہ اٹھتے: "بجا تو بانسری بیٹا۔ سارا دن تیری راہ

دیکھی ہے۔" بھولا بانسری ہونٹوں سے لگا لیتا۔ ستاروں کا کارواں آسمان میں بڑھتا رہتا، رات گذر جاتی۔ بانسری کی سُریلی، جادو بھری آواز اُن کے سارے دُکھ دور کر دیتی۔ "جیتا رہ بیٹا ..... جگ جگ جیے"، "خدا تیرا بھلا کرے، میرے بچے!" لوگ دعائیں دیتے۔ پیار کے یہ بول اس کا سب سے بڑا انعام تھے بھولا انہیں سُن کر پھولا نہ سماتا۔ وہ بادشاہ تھا بانسری کا۔ اس کے سُروں کا اور لوگوں کے دلوں کا۔

ایک دن جب وہ برگد سے ٹیک لگائے بانسری بجا رہا تھا تو راجہ کے سپاہی وہاں آپہونچے اور اس سے کہا۔ "چلو راجہ کے محل۔" "مگر کیوں کیا کیا ہے میں نے؟" اس نے گھبرا کر پوچھا۔

"ہم کچھ نہیں جانتے" سپاہیوں نے اکڑ کر کہا۔ "تمہیں ابھی چلنا ہے۔"

سپاہی اُسے راجہ کے محل میں لے آئے۔ محل سُرخ پتھر سے بنا ہوا تھا۔ بھولا اس کی شان و شوکت دیکھ کر سہم گیا۔ راجہ ہیروں سے جڑے تخت پر اُداس بیٹھا تھا۔ اس کے پاس ہی ایک بوڑھا ادب سے کھڑا تھا۔ بھولا نے راجہ کو سلام کیا۔ راجہ نے اُس کی طرف دیکھ کر بوڑھے سے کہا:۔ "یہ ہے وہ لڑکا! اتنا چھوٹا سا!"

"جی مہاراج!" بوڑھے نے جواب دیا۔ "سارے ملک میں اس جیسا بانسری بجانے والا کوئی نہیں اس کی بانسری جادو جگاتی ہے۔ سارا جنگل بانسری کے سروں کی مٹھاس سے بھرا رہتا ہے۔ اس کی بانسری کی آواز میں کوئل کی کوک کا راگ اور بلبل کے گیتوں کی مٹھاس ہے۔ یہی ہے وہ۔"
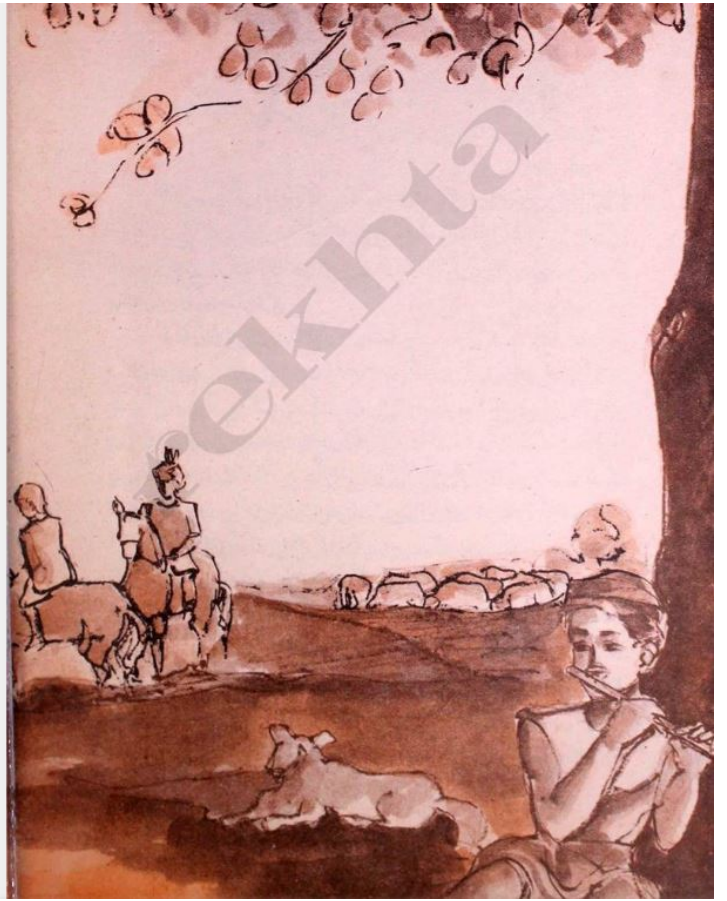
راجہ نے ٹھنڈی سانس لی بوڑھے وزیر سے کہا: "ہم ملک کے سارے گانے والوں، شاعروں اور فنکاروں کو آزما چکے مگر ہمارے دل کی اداسی دور نہیں ہوئی۔ ہمیں خوشی چاہیئے چاہے وہ پل بھر کی ہی ہو، کیا تمہیں یقین ہے اس کی بانسری ہمارا دل بہلا سکے گی ؟ جب ملک کے مانے ہوئے استاد ناکام ہو گئے تو پھر یہ لڑکا تو ابھی بہت چھوٹا سا ہے !"

"آزما کر تو دیکھیں مہاراج" وزیر نے کہا۔ "فن عمر سے نہیں آتا۔"

"تم نے بانسری بجانا کس سے سیکھا ؟" راجہ نے پوچھا۔

"کسی سے بھی نہیں، مہاراج" بھولا گڑگڑایا: "نہ جانے کب اور کس طرح میں بجانے لگا، گاؤں والے تعریف کرتے ہیں مگر مجھے تو کچھ بھی پتہ نہیں۔"

"اچھا تو سنو" راجہ بولا: "اگر تمہاری بانسری ہمیں خوش کر سکی تو ہم تمہارے سُر خرید لیں گے۔ ہم تمہیں بہت سی دولت دیں گے۔ تم محل میں رہو گے۔ جو چاہو گے ملے گا۔ اٹھاؤ بانسری اور شروع ہو جاؤ۔"

بھولا نے بانسری ہونٹوں سے لگائی اور وہ خود حیران رہ گیا۔ بانسری میں سے نکلنے والے سُروں کو وہ خود بھی نہ پہچان سکا۔ ان میں کوئی مٹھاس نہ تھی بلکہ بھدّی سی، بھاری آواز نکل رہی تھی۔ وزیر بھی پریشان تھا۔ "بند کرو یہ بے سُرا راگ۔" راجہ نے گرج کر کہا۔ "اور نکال کر باہر کر دو اسے۔ وزیر صاحب! کیا تم نے ہمارے ساتھ مذاق کیا ہے ؟ تم نے ہم سے جھوٹ بولا۔ کیا اسی بے سُری بانسری کو تم جادو کہتے ہو۔"

بھولا سر جھکائے محل سے دور چلا جا رہا تھا۔ اس کا دل ڈوبا جا رہا تھا۔ آنکھوں میں اندھیرا چھا رہا تھا۔ اس کی بانسری کو کیا ہو گیا تھا، اس کے سُر کہاں کھو گئے تھے۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

جب وہ گاؤں پہنچا تو رات ہو چکی تھی۔ چوپال پر لوگ اس کی راہ تک رہے تھے۔ اسے دیکھتے ہی وہ سب بول اُٹھے "ارے آج کہاں رہ گیا تھا" بھولا ؟"

بھیکو کھانسی سے ہانپتے ہوئے بولا۔ "بیٹا جلدی سُنا بانسری۔ کھانسی مارے ڈالتی ہے۔"

گوپال دادا کی پوپلی آواز آئی "آج میرا جی اچھا نہیں۔ بھولا ایسی بانسری بجا کہ اپنا ہوش نہ رہے۔"

بھولا نے بانسری ہونٹوں سے لگالی اور اس میں سے جادو پھوٹنے لگا۔ بھیکو کی کھانسی ٹھہر گئی۔ گوپال دادا اُچھل اٹھے اور سارے گاؤں والے جھوم اٹھے۔ آج تو بانسری میں اور دنوں سے بھی زیادہ مٹھاس تھی۔

چوپال کے پاس درختوں کی آڑ میں کھڑا راجہ وزیر سے کہہ رہا تھا۔ "تمہاری بات سچ تھی۔ اس کی بانسری نے میرے اُداس دل میں خوشی بھر دی ہے۔ میرے دل کو اتنا سکون کبھی نہیں ملا۔ بانسری میں جادو ہے مگر محل میں اسے کیا ہو گیا تھا؟"

محل میں بانسری کے سُر کھو گئے تھے۔ وزیر نے کہا: "کیونکہ وہ محلوں کے لیے نہیں بلکہ غریب گاؤں والوں کے لیے ہیں۔ آپ نے اس کے سُروں کو دولت سے خریدنا چاہا مگر خریدے ہوئے سُر کبھی میٹھے نہیں ہوتے۔ اِس گاؤں میں بھولا اپنے سُروں کا راجہ ہے اور اس کا انعام ان دُکھی دلوں کی دُعائیں ہیں جن کے سامنے ساری دنیا کی دولت بھی کچھ نہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" راجہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولا "جب کبھی دل دُکھی ہوگا، میں رات کے اندھیرے میں چپکے سے یہاں آکر بانسری کی آواز سُن جایا کروں گا۔"

سچائی کا جادو

سُرجیت

بہت دن پہلے کی بات ہے ایک گاؤں میں دو بھائی رہتے تھے۔ اُن کا باپ ایک غریب کسان تھا۔ بڑا بھائی بُری صحبت میں رہ کر چور بن گیا۔ باپ نے اُسے سمجھایا لیکن وہ اپنی عادت نہ چھوڑ سکا۔ تنگ آکر باپ نے اُسے گھر سے نکال دیا۔

کچھ دن کے بعد کسان اچانک بیمار پڑ گیا اور چند روز بیمار رہنے کے بعد چل بسا۔ کسان کے پاس تھوڑی سی زمین تھی چھوٹا بھائی اور اُس کی ماں اُس زمین کو گاؤں کے ساہوکار کے پاس گروی رکھ کر اپنا گزارہ چلانے لگے۔ چھوٹا بھائی بہت محنتی تھا۔ اُس نے زمین گروی رکھتے وقت سوچا کہ وہ شہر میں جاکر روپے کمائے گا اور پھر اپنی زمین ساہوکار سے واپس لے لے گا۔ یہ سوچ کر اُس نے ماں سے اجازت لی اور شہر کی طرف چل پڑا۔

شہر میں وہ ایک ڈاکٹر کے یہاں نوکر ہو گیا۔ ڈاکٹر اُس کی محنت اور ایمان داری سے بے حد خوش رہتا تھا۔ چھوٹا بھائی خرچ بھی کم کرتا تھا اور زیادہ سے زیادہ پیسے بچاتا تھا۔ اِس طرح وہ کئی برس تک پیسے بچاتا رہا۔ یہاں تک کہ اُس نے دو سو روپئے جمع کر لیے۔ ایک دن اُس نے ڈاکٹر سے کہا: "ڈاکٹر صاحب اب میں گاؤں جاکر اپنی ماں کی خدمت کروں گا۔" ڈاکٹر اُس کی بات سُن کر بہت خوش ہوا اور چلتے وقت ڈاکٹر نے بھی اپنی طرف سے اُسے کچھ روپئے دے دیے۔

چھوٹا بھائی گاؤں کی طرف روانہ ہو گیا۔ راستے میں ڈاکوؤں نے اُسے گھیر لیا اور اُس سے تمام رقم چھین لی۔ روپوں کے یوں چھن جانے پر اُسے بہت دُکھ ہوا۔ اس نے سوچا کہ روپوں کے بغیر وہ گاؤں جاکر کیا کرے گا۔ اُس نے ڈاکوؤں سے کہا

"بھائیو۔ مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو۔ میں تم لوگوں کی خدمت کروں گا۔"

ڈاکوؤں کو اس پر ترس آگیا اور سردار نے اُس کی بات مان لی۔ اُنہوں نے اُس کی آنکھوں پر پٹی باندھی اور اُسے اپنے ٹھکانے پر لے گئے۔ وہ ڈاکوؤں کا کھانا تیار کرنے لگا۔ ایک روز اُس نے ڈاکوؤں

کے سردار سے کہا

"بھائی میں اب پھر شہر جانا چاہتا ہوں۔ اِس لیے مجھے اجازت دیجیے۔ آپ نے مجھ سے دو سو روپے لیے تھے۔ اِس کے بدلے آپ مجھے ایک چھوٹی سی تلوار دیجیے تاکہ میں جنگلی جانوروں سے اپنی حفاظت کر سکوں۔"

ڈاکوؤں کے سردار نے لمحہ بھر سوچا، پھر اُسے شہر جانے کی اجازت دے دی اور کہا۔ "ہم لوٹی ہوئی چیزیں واپس نہیں کرتے۔ ویسے ہمارے پاس بہت سی تلواریں ہیں۔ تم اِن میں سے کوئی تلوار لے لو۔"

سردار نے اُس کے سامنے بہت سی تلواروں کا ڈھیر لگا دیا۔ اُس نے ایک زنگ لگی تلوار لے لی۔

ڈاکوؤں نے اُس کی آنکھوں پر پٹی باندھی اور اُسے سڑک پر چھوڑ گئے۔

چلتے چلتے چھوٹا بھائی شہر پہنچ گیا۔ اُس نے ڈاکٹر کے پاس جا کر اپنی دُکھ بھری داستان سنائی۔ ڈاکٹر نے اُسے پھر نوکر رکھ لیا۔ ڈاکٹر تلواروں کا بہت شوقین تھا۔ اُس نے چھوٹے بھائی کی زنگ لگی تلوار کو دیکھا تو کچھ ایسا لگا جیسے یہ تلوار بہت نایاب اور پرانے زمانے کی ہو۔ اُس کا ایک دوست تلواروں کا ماہر تھا۔ ڈاکٹر نے اُسے تلوار دکھائی۔ وہ اس تلوار کو دیکھ کر خوشی سے اُچھل پڑا اور کہنے لگا۔

"یہ تلوار سچ مچ بے حد نایاب اور قیمتی ہے۔ اگر تم اِسے بیچنا چاہو تو میں چار سو روپے میں خرید سکتا ہوں۔"
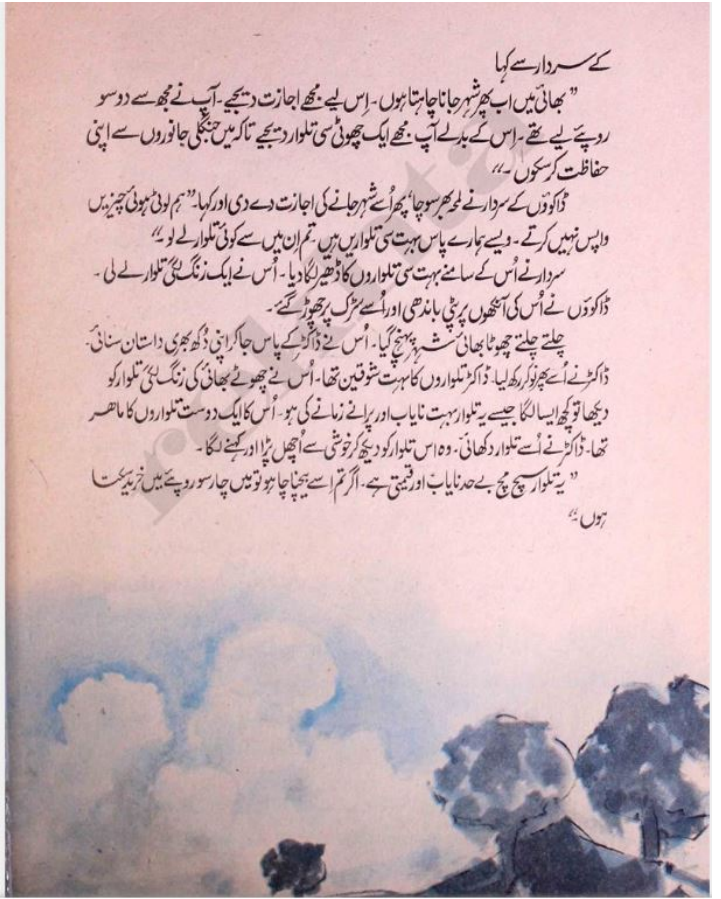
چھوٹے بھائی نے فوراً تلوار چار سو روپے میں بیچ دی۔ اب اُس کے پاس کافی روپے ہو گئے تھے۔ اِس لیے اُس نے پھر گاؤں جانے کا فیصلہ کیا۔ راستے میں اُس کی ملاقات پھر ڈاکوؤں کے سردار سے ہوئی۔ سردار اُسے دیکھ کر حیران ہوا۔ چھوٹے بھائی نے سلام کرنے کے بعد جیب سے دو سو روپے نکال کر ڈاکوؤں کے سردار کے سامنے رکھ دیے۔ سردار نے پوچھا "یہ روپے کیسے ہیں؟"

چھوٹے بھائی نے جواب دیا۔ "آپ سے جو زنگ لگی تلوار میں نے لی تھی، وہ بہت قیمتی نکلی اور چار سو روپے میں بک گئی۔ آپ نے پچھلی بار مجھ سے دو سو روپے چھین لیے تھے اِس لیے وہ میں نے رکھ لیے۔ یہ باقی دو سو روپے ہیں۔"

سردار یہ بات سُن کر دنگ رہ گیا کہ دنیا میں اتنے ایمان دار اور سچے آدمی بھی ہو سکتے ہیں۔ سردار نے اُس سے اُس کے گاؤں اور باپ کا نام پوچھا۔ چھوٹے بھائی نے اپنے گاؤں اور باپ کا نام بتا دیا۔ ڈاکوؤں کا سردار پوری بات سُن کر اُس کے گلے سے لگ گیا اور بھرّائی ہوئی آواز میں بولا۔
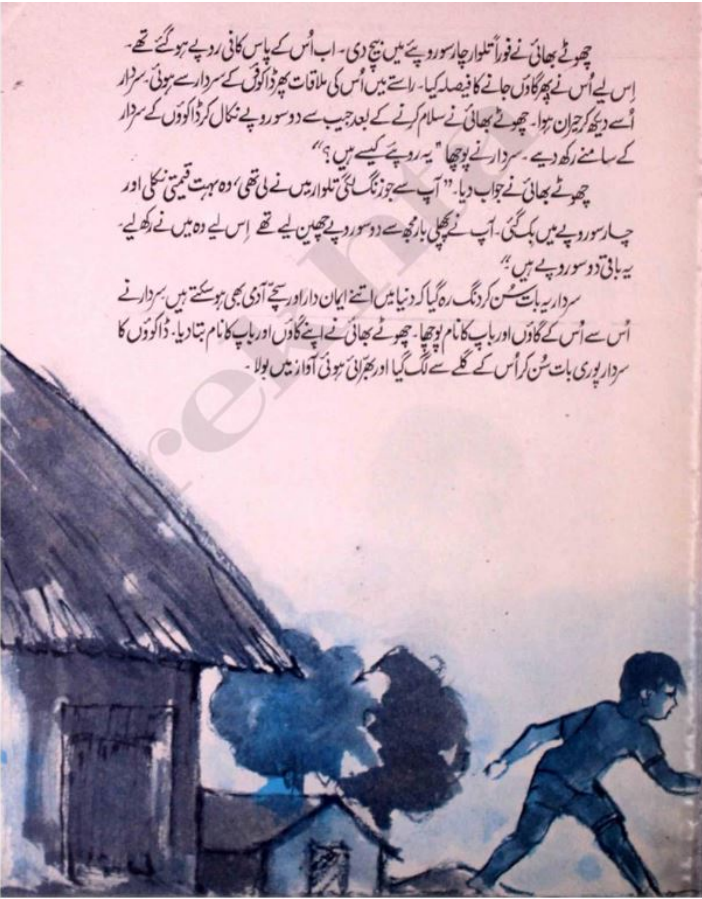
"میں تمہارا بڑا بھائی ہوں۔ میں بچپن میں بُری صحبت میں پڑ کر چور بن گیا تھا اس لیے پتاجی نے مجھے گھر سے نکال دیا تھا۔ پھر میں ڈاکو بن گیا۔ لیکن اب میری سمجھ میں آ گیا ہے کہ میں غلط راستے پر ہوں۔ میں آج سے ڈاکے ڈالنا چھوڑ دوں گا، اب میں تمہارے ساتھ گاؤں میں چل کر رہوں گا اور ماں باپ کی خدمت کروں گا۔"

چھوٹے بھائی سے باپ کے مرجانے کا سُن کر سردار کو بہت دکھ ہوا۔ پھر سردار نے اپنے ساتھیوں کو بلایا اور کہا۔ "بھائیو! میں آج سے یہ بُرا کام چھوڑ رہا ہوں۔ اچھا ہو گا کہ تم بھی یہ بُرا کام چھوڑ دو۔"

پھر اُس نے لوٹا ہوا دھن ان میں بانٹ دیا۔ دونوں بھائی گاؤں کی طرف چل دیے۔ اُن کی ماں انہیں دیکھ کر خوشی سے پھولی نہ سمائی۔ اُنہوں نے ساہوکار سے اپنی زمین واپس لے لی اور کھیتی باڑی کرنے لگے۔ اچھی عقل آتے دیر لگتی ہے، مگر بُرا وقت گزرتے دیر نہیں لگتا۔
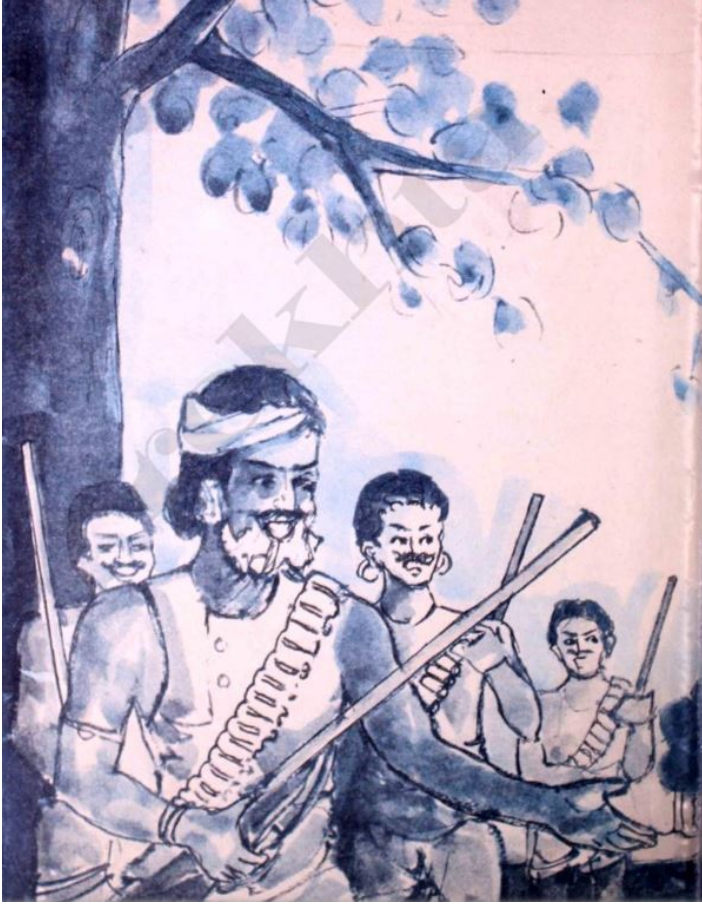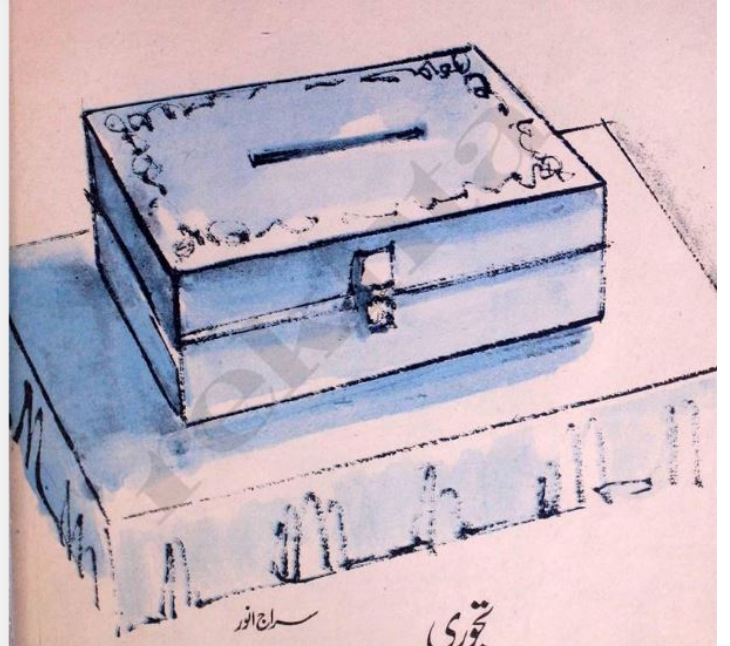
تجوری

سراج انور

ثروت کی عمر کچھ زیادہ تو تھی نہیں، بس یہی کوئی آٹھ دس سال کی ہوگی۔ وہ اپنے ماں باپ کا کہنا بھی بہت مانتی تھی اور پڑھائی میں بھی بہت تیز تھی، بس اُس میں اگر کوئی برائی تھی تو صرف یہ کہ وہ تھوڑی سی ندیدی اور پیٹو تھی۔ گلی میں سے کوئی بھی پھیری والا اُس کے گھر پر آواز دیے بغیر نہیں گذر سکتا تھا۔ جہاں آواز آئی "کھالو ملائی کی طرف — ٹھنڈے میٹھے رس گلے" بس وہ دوڑتی ہوئی جاتی اور امی کے سر پر سوار ہوجاتی کہ لائیے امی بیس پیسے! — اب امی کے پاس کوئی خزانہ تو تھا نہیں کہ وہ روزانہ ثروت کی فرمائشیں پوری کرتی رہیں۔ وہ اُس کی اِس روز کی لاڈ لاڈ سے تنگ آچکی تھیں اور اُس کی فضول خرچی سے

جب اُنہوں نے ثروت کے ابا کو یہ بات بتائی تو انہوں نے طے کیا کہ ثروت کا جیب خرچ اُسے الا بلا کھانے کے لیے نہیں دیا جائے بلکہ کہیں جمع کر دیا جائے۔ مگر بھلا کبھی ایسا ہوا ہے کہ بچوں کو پیسے ملیں اور وہ انہیں خرچ نہ کریں! آخر ابا کے دماغ میں ایک ترکیب آہی گئی۔ شام کو جب وہ دفتر سے لوٹے تو ان کے ہاتھ میں ایک خوبصورت سی تجوری نما گلک تھی۔ یہ تجوری انہوں نے ثروت کو دیتے ہوئے کہا۔

"دیکھو ثرو! میں تمہارے لیے یہ کھلونا تجوری لایا ہوں۔ اگر تم وعدہ کرو کہ خراب چیزیں نہیں کھاؤ گی تو تمہیں بیس کے بجائے تیس پیسے دیا کروں گا۔ مگر شرط یہ ہے کہ تم تیس میں سے بیس تو اس تجوری میں ڈالوگی اور صرف دس کی چیز کھاؤ گی۔ بولو منظور ہے؟"

تجوری اتنی خوبصورت تھی کہ ثروت کو فوراً وعدہ کرلینا پڑا اُس نے سوچا کہ وہ تجوری سے کھیل بھی سکتی ہے کھیل کا کھیل اور پیسے بھی بڑھ جائیں گے مفت میں! ابا نے اُسے بتایا کہ جب تجوری پیسوں سے بھر جائے گی تو وہ اُسے نیچے سے کھول بھی سکتی ہے اور کوئی اچھی سی کتاب یا کھلونا خرید سکتی ہے۔ یہ بات سُن کر ثروت کا دل بلیّوں اچھلنے لگا۔ ہائے کتنے ڈھیر سارے پیسے ہوجائیں گے! وہ کتنی امیر ہوجائے گی۔ تب وہ اپنے شریر اور ضدی بھائی انجم اور اس کے منہ چڑھے دوستوں کی نگاہوں میں کتنی اونچی ہوجائے گی؟ اُس وقت کا خیال آتے ہی وہ آپ ہی آپ مسکرانے لگی اور جب ابا نے اپنے پاس سے پہلی بار ایک روپے کا سکہ اس تجوری میں ڈالا تو اس کے جھناکے کی آواز سُن کر ثروت ہنسنے لگی۔ کتنی پیاری لگی تھی وہ آواز —!

وعدے کے مطابق وہ تیس میں سے بیس پیسے ہر صبح اس تجوری میں ڈال دیتی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ جب تجوری بھر جائے گی تو وہ سب روپے نکال کر اپنی سہیلیوں کی ٹھاٹ دار دعوت کرے گی۔ تب وہ کتنی خوش ہوں گی —! اُس کی سہیلی نجمہ کی تو بانچھیں کھل جائیں گی۔ ثروت اچھی طرح جانتی تھی کہ نجمہ بہت ہی غریب ماں باپ کی لڑکی ہے۔ بعض دفعہ تو وہ اسکول میں دوپہر کا کھانا بھی نہیں لاتی تھی۔ گھر میں پکتا ہی نہیں تھا تو لاتی کیسے؟ ایسے وقت میں ثروت اسے اپنے ساتھ کھلاتی وہ بے چاری پہلے تو انکار کرتی مگر پھر ثروت کے زور دینے پر مان جاتی۔

تجوری ثروت کے پاس کیا آئی جیسے اُس کے عیش آگئے۔ کبھی کبھار امی بھی اپنے پاس سے چند سکے اُس میں ڈال دیتیں اس طرح ثروت کا دل بڑھ جاتا۔ ہر رات وہ تجوری کو اپنے سرہانے رکھ کر سوتی اور اس ڈر سے کہ کہیں رات کو خواب میں کوئی چور نہ آجائے، وہ پٹاخے والا ایک پستول اپنے تکیے کے نیچے رکھ لیا کرتی کہ نہ جانے کب اُس کی ضرورت پڑ جائے

تجوری میں پیسے روز بروز بڑھتے گئے اور ساتھ ہی ثروت کی زیادہ سے زیادہ جمع کرنے کی خواہش بھی بڑھتی گئی۔ وہ بار بار تجوری کو ہتھیلی پر رکھ کر وزن کرتی "کہ اب وہ کتنی بھاری ہو گئی ہے!" نجمہ ان باتوں کو بڑی دلچسپی سے سُنا کرتی ایک دن ثروت نے اُس سے کہا۔

"تم بھی اپنے ابّا سے کہہ کر ایک تجوری منگوا لو۔۔۔ ایک مہینے میں اتنے سارے پیسے ہو جائیں گے۔"

"میں کس سے منگواؤں۔ میرے ابّا تو مر چکے ہیں۔" نجمہ نے غمگین آواز میں جواب دیا۔

"ہاں میں تو بھول ہی گئی تھی۔" ثروت نے افسوس کرتے ہوئے کہا۔ "تو پھر اپنی امی سے کہو۔ وہ لادیں گی۔"

"امی کو کپڑے سینے سے ہی فرصت نہیں ملتی کہ وہ بازار جا کر لادیں۔"

"ہاں یہ تو ہے۔" ثروت کچھ سوچ کر بولی۔ "اچھا تو پھر اپنی امی سے تم بھی تیس پیسے لے لیا کرو اور ان پیسوں کو مٹکے میں ڈال دیا کرو۔ بہت سارے روپے ہو جائیں گے۔"

یہ سنتے ہی نجمہ نے گردن جھکالی اُس کی خوبصورت آنکھوں میں پانی تیرنے لگا اور وہ آہستہ سے بولی۔

"ہم تمہاری طرح امیر تھوڑی ہی ہیں ثرّو۔ تم تیس پیسے کی بات کرتی ہو' امی تو مجھے ایک پیسہ بھی نہیں دیتیں۔ امی مجھے اور گڈو کو تو روٹی کھلادیتی ہیں لیکن خود بھوکی رہتی ہیں۔"

نجمہ تو یہ کہہ کر چلی گئی مگر ثروت کا ننھا سا دل تڑپ کر رہ گیا۔ ہائے! اُس کی اتنی پیاری سہیلی اور اتنی غریب! اُس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کرے' کس طرح اُس کا دُکھ دور کرے؟ اگلے مہینے عید آنے والی تھی لہٰذا عید کی خوشی میں وہ سب بھول گئی ابا بڑے اچھے کپڑے خرید کر لائے تھے امی اس کے لیے بڑا ہی خوب صورت اور جھم جھم کرتا ہوا جوڑا سی رہی تھیں۔ اس جوڑے میں سُرخ رنگ کے بڑے بڑے پھول تھے جن میں ستارے ٹنکے ہوئے تھے۔ ثروت کا جی چاہتا تھا کہ وہ اس جوڑے کو ابھی پہن لے مگر عید کے دن ہی پہنے جاسکتے تھے۔ جب اُس نے نجمہ کو اپنے خوبصورت جوڑے کے بارے میں بتایا تو وہ ہنس کر بولی۔
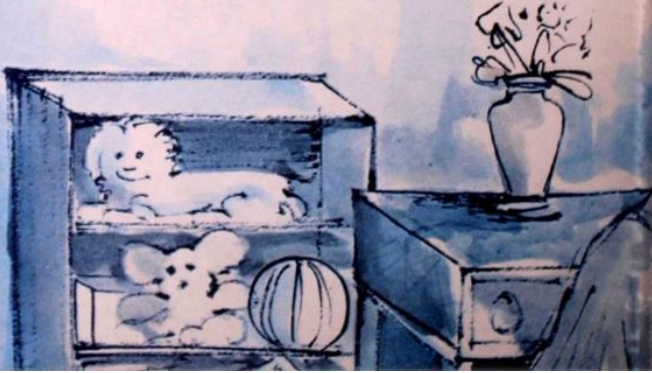
"کیوں نہیں تمہارے کپڑے اچھے نہیں ہوں گے تو اور کس کے ہوں گے تم تجوری میں پیسے جو جمع کر رہی ہو۔"

"ارے مگر میرا جوڑا تو امی اور ابو بنا رہے ہیں۔ میری تجوری کے پیسوں میں سے تھوڑی ہی بن رہے ہیں۔" ثروت نے جلدی سے کہا۔ "اچھا بتاؤ تمہارے کپڑے کیسے سل رہے ہیں؟"

"ہمارا تو کوئی بھی جوڑا نہیں بنا۔ اماں کے پاس روپے ہی نہیں ہیں۔" نجمہ نے منہ بسور کر جواب دیا۔

"ہے ہے!" ثروت چیخی۔ "تو تم عید پر کوئی نیا کپڑا نہیں پہنو گی؟"

"نہیں پرانے کپڑوں کو ہی پہن لوں گی۔" نجمہ نے شرمندگی سے جواب دیا۔

نجمہ چلی گئی تو ثروت نے سوچا کہ وہ اپنے ابّو سے کہے گی کہ وہ اس کے لیے بھی ایک جوڑا سلوا دیں۔ وقت گذرتے دیر کیا لگتی ہے۔ عید آ گئی۔ سب نے نئے کپڑے پہنے۔ ابا جب عید گاہ سے واپس آئے تو نجمہ عید کا سلام کرنے گھر میں داخل ہوئی۔ سب نے دیکھا کہ وہ بالکل نئے اور خوبصورت ڈیزائن کے کپڑے

پہنے ہوئے ہے۔ وہ اُس سے کچھ کہنے ہی والی تھی کہ ابّو نے نجمہ کے سوال کا جواب دے کر کہا۔ "آؤ بیٹی، خوب موقع پر آئیں۔ میں سب بچوں کو عیدی دینے ہی والا تھا۔"

"لائیے ابا جی پہلے مجھے عیدی دیجیے۔" ثروت کے بھائی انجم نے اٹھلا کر کہا۔

"بھئی عیدی تو سب کو ملے گی مگر ہم تو سب سے پہلے نجمہ بیٹی کو عیدی دیں گے کیونکہ اس نے سب سے پہلے ہمیں سلام کیا ہے۔" ابا نے پانچ روپے کا نوٹ نجمہ کو دیتے ہوئے کہا۔

"اور مجھے؟" انجم بے تاب تھا۔

"لو تم بھی یہ پانچ روپے لو۔" ابّو نے کہا۔ "مگر میں جانتا ہوں کہ تم الٹی سیدھی چیزیں کھا کر سب روپے ایک منٹ میں ختم کر ڈالو گے تمہیں اپنی چھوٹی بہن سے سبق سیکھنا چاہیے کہ وہ کتنے مہینوں سے

اپنی کھلونا تجوری میں روپے جمع کر رہی ہے یقیناً اب تک سو روپے سے زیادہ ہو گئے ہوں گے۔ کیوں ثروت بیٹی؟"

"جی ہاں" ثروت نے صرف اتنا ہی کہا۔

"اچھا لاؤ اب اپنی تجوری میں تمہیں سب سے زیادہ عیدی دوں گا۔ یعنی دس روپے مگر شرط وہی ہوگی یعنی میرے سامنے آٹھ روپے تم تجوری میں ڈالوگی اور صرف دو روپے خرچ کروگی۔"

"وہ تو ٹھیک ہے ابّا جی — مگر" ثروت چپ ہو گئی۔

"کیوں۔ کیا ہوا۔ تم چپ کیوں ہو گئیں؟"

"میری تجوری اب بالکل خالی ہے۔ اُس میں ایک بھی پیسہ نہیں ہے۔"

ثروت کے یہ کہتے ہی ابّا کو غصہ آگیا وہ سمجھ گئے کہ ثروت نے گلی سڑی چیزیں اور چاٹ وغیرہ کھانے میں سب روپئے برابر کر دیے ہیں۔ وہ بار بار پوچھتے رہے مگر ثروت نے جواب نہیں دیا۔ آخر ابّا اُسے مار بیٹھے۔ وہ رونے لگی۔ ابّا پھر مارنا چاہتے تھے کہ نجمہ ثروت کے آگے آکر بولی۔

"اِسے مت ماریے چچا جان۔ مجھے ماریے، خطادار میں ہوں۔"

"تم نے کیا کیا ہے؟" ابّا غصے سے بولے۔

"ثروت نے روپئے کھائے نہیں بلکہ اُن روپوں کا ایک جوڑا اس نے اپنی خالہ جان سے سلوا کر مجھے دے دیا ہے۔ یہی جو میں پہنے ہوئی ہوں۔" ابّا حیرت سے ثروت کو تکنے لگے۔ نجمہ کہہ رہی تھی کہ میں نہیں مان رہی تھی مگر اس نے زبردستی اپنی خالہ سے میرے کپڑے سلوائے۔ اس نے کہا تھا کہ اگر میں نئے کپڑے نہیں پہنوں گی تو یہ مجھ سے کٹّی کر دے گی اور کبھی نہ بولے گی۔ مجھے مجبوراً ماننا پڑا چچا جان۔ اگر آپ ناراض ہیں تو میں یہ جوڑا اُتار دیتی ہوں۔" ابّا گم سُم تھے۔ انہوں نے روتی ہوئی ثروت کو دیکھا اور پھر خود بھی رونے لگے۔ اُنہوں نے لپک کر اُسے اپنے سینے سے لگایا اور اُسے پیار کرتے ہوئے بولے:

"میں تم سے بچت کرانا چاہتا تھا مگر تم نے واقعی اچھی بچت کی بیٹی، بہت بڑی بچت! شاباش! تم سچ مچ میری بیٹی ہو۔ تم نے وہ کام کیا ہے کہ میں تم پر جتنا بھی فخر کروں کم ہے۔ تم نے ایک ایسی تجوری میں رقم جمع کی ہے جس میں کبھی روپے نہیں گھٹتے۔ بلکہ ہمیشہ بڑھتے ہی رہتے ہیں۔ اللہ میاں کے خزانے میں جمع کی ہوئی یہ دولت ہمیشہ بڑھتی ہی جائے گی۔"

نجمہ جوڑا اتار رہی تھی کہ ابّا نے اُسے منع کر دیا اور اُسے خوب پیار کیا۔ اگلی صبح جب ثروت سو کر اٹھی تو یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی کوئی حد نہ رہی کہ اُس کے سرہانے رکھی ہوئی کھلونا تجوری پوری بھری ہوئی